داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

# بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

(نواں ایڈیشن) ——— صفحات:360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ

(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ

(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف

(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 475 روپے

حصہ پنجم سُورۃُ مَریَم تا سُورۃُ السَّجدۃ

(تیسرا ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات

(پہلا ایڈیشن) ——— صفحات 484، قیمت 590 روپے

ملنے کے پتے

انجمن خُدام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور

A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: (091)2584824,2214495

مکتبہ خُدام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)





محرم الحرام ۱۴۳۶ھ

نومبر ۲۰۱۴ء


# ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اسلام میں شرم وحیا

اور

استقامت کی اہمیّت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!


جلد : 63

شمارہ : 11

محرم الحرام 1436ھ

نومبر 2014ء

فی شمارہ 25/-


# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ


مدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مدیر

حافظ خالد محمود خضر



سالانہ زرِتعاون

| | |
|---|---|
| اندرون ملک | 250 روپے |
| بھارت و بنگلہ دیش | 900 روپے |
| ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ | 1200 روپے |
| امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ | 1500 روپے |

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ




# مشمولات


**عرضِ احوال** 5

جہالتِ جدیدہ بمقابلہ جہالتِ قدیمہ — ایوب بیگ مرزا

**بیانُ القُرآن** 9

سورۃ الکھف (آیات ۵۰ تا ۸۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

**تفہیمُ القُرآن** 26

دینی کام سے کس کی معذرت قبول ہوتی ہے — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

**مطالعۂ حدیث** 28

اسلام میں شرم و حیا اور استقامت کی اہمیت — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

**تذکیر و موعظت** 47

دعا کی حقیقت اور اہمیت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

**اشارات** 51

آپ حج سے کیا لے کر لوٹے؟ — نعیم صدیقی مرحوم

**حقیقتِ دین** 61

اخلاصِ نیّت اور ریاکاری (۲) — جمیل الرحمٰن عباسی

**دعوتِ فکر** 78

کتنا بدل گیا ہے تری انجمن کا رنگ! — عدیل احمد آزاد

**نقد و نظر** 87

کیا بائبل کا مطالعہ ضروری ہے؟ — پروفیسر عبداللہ شاہین

**بحث و نظر** 93

ذوالقرنین، سدِّ ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج (۳) — شاہین عطر جنجوعہ


❁ ❁ ❁

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

# جہالتِ جدیدہ بمقابلہ جہالتِ قدیمہ

جہالتِ قدیم ہو یا جدید انسانی معاشرے کے لیے ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ جہالت قدیمہ کیا تھی؟ غلاموں کی منڈیاں لگتی تھیں اور انسان کی خرید وفروخت سرِ عام اور سرِ بازار ہوتی تھی۔ حوّا کی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ حاکمِ وقت جس کی زبان قانون کا درجہ رکھتی تھی وہ اپنے کسی ناپسندیدہ شخص کو سزا دینے کا یہ طریقہ بھی اختیار کر لیتا تھا کہ اجتماعِ عام میں اُسے بھوکے شیر کے پنجرے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ جب شیر بنی آدم کی چیر پھاڑ کرتا تو یہ مجمع قہقہے اور ٹھٹھے لگاتا۔ لیکن تب دنیا بہت بڑی تھی۔ پہیہ ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔ مواصلاتی نظام انتہائی سست رو تھا۔ میڈیا نامی کوئی شے نہ تھی۔ بات سینہ بہ سینہ آگے پہنچتی' لہٰذا اچھائیوں اور برائیوں کے اثرات محدود رہتے تھے۔ ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ تک پہنچ بھی جاتے تب بھی علاقائی حدود نہ پھلانگ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض برائیاں افراد اور نجی سطح پر ہونے کے باوجود اُسی معاشرے میں پوری طرح نفوذ نہ کر سکیں۔ مثلاً معاشی سطح پر سود تھا' لیکن جب دو افراد قرض کا لین دین سود کی بنیاد پر کرتے تو وہی دو افراد یا زیادہ سے زیادہ وہی دو گھرانے متاثر ہوتے تھے۔ معاشرے اور سوسائٹی پر بحیثیت مجموعی اُس کے اثرات بہت کم اور جزوی پڑتے تھے۔ ظلم تھا' کفر تھا' شرک تھا' کذبِ بیانی تھی' لڑائی جھگڑے تھے' لیکن جو کچھ تھا ظاہر و باہر تھا' منافقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن آج کا دور جسے جدید دور کہا جاتا ہے' اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کو یہ کرۂ ارض کم پڑ رہا ہے اور وہ انسان کے لیے چاند اور مریخ میں جگہ تلاش کر رہی ہے۔ اور اپنے معاشرہ کو بزبانِ خود مہذب معاشرہ کہا جاتا ہے۔ بڑے پُرزور اور پُرجوش انداز میں یہ الفاظ ادا کیے جاتے ہیں Our Civilized Society سیاسی اور عمرانی سطح پر جمہوریت اور جمہوری طرزِ حکومت کو ترقی کے زینہ کا آخری step قرار دیا جاتا ہے۔ گویا انسانی اجتماعیت نے اِس شعبہ میں چوٹی سر کر لی ہے اور منزل پالی ہے۔ لہٰذا فرمودۂ مغرب یہ ہے کہ سیاسی اور عمرانی سطح پر یہ End of the history ہے۔ آیئے' ہم بھی اِس جدید دور پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔ قرآنِ مجید کے اِس حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے جو اُمتِ مسلمہ کو مخاطب کرتے ہوئے دیا گیا ہے اور جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ کسی فرد یا قوم کی دشمنی تمہیں انصاف کی راہ سے نہ ہٹا دے۔ اِس حکم کو



ایک اصول تصور کرتے ہوئے ہم جدید دور کا جائزہ لیتے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی معاشرہ دورِ قدیم کا ہو یا جدید کا کلیتًا اچھائی اور خیر سے محروم نہیں ہو سکتا' اِس لیے کہ اچھائی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اِسے مسخ کیا جا سکتا ہے' کچلا جا سکتا ہے' ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہر معاشرے میں کسی نہ کسی درجے میں' کسی نہ کسی انداز میں موجود رہے گی' ناپید نہیں ہو گی۔ لہٰذا ہم نے نہ ہی دورِ قدیم کی اچھائیوں کا ذکر کیا ہے نہ ہی دورِ جدید کی اچھائیوں کا ذکر کریں گے' یہ جتنی ہیں کم ہیں۔ اچھا معاشرہ وہ ہے جس میں اچھائی غالب ہو' اور برا معاشرہ وہ ہے جس میں برائی غالب ہو۔ لہٰذا قدیم اور جدید معاشرے کا ذکر اور تقابل برائیوں کی نسبت وتناسب سے ہو گا۔ جدید دور میں انسان کھلی منڈی میں خریدا اور بیچا نہیں جاتا۔ مالیاتی اداروں کے چمکتے دمکتے دفاتر میں انسانی گروہ' جماعتیں اور اقوام بِک جاتی ہیں اور خرید لی جاتی ہیں۔ یعنی فرد براہِ راست خریدا نہیں جاتا' گروہوں' جماعتوں اور اقوام کے واسطے سے فروخت ہوتا ہے۔ پھر جماعتوں اور قوموں کے سربراہ اُسے re-sale کرتے ہیں۔ منافع دو جگہ تقسیم ہونے کی وجہ سے دورِ جدید کے انسان کو دورِ قدیم کے انسان کی نسبت اپنی قیمت کم وصول ہو رہی ہے' کیونکہ انسانوں کے لاٹ فروخت ہوتے ہیں' لہٰذا اُس کی مارکیٹ ویلیو کم ہو گئی ہے اور وہ پہلے کی نسبت سستے داموں فروخت ہونے پر مجبور ہے۔ سود آج کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ جاہلیتِ جدیدہ میں سود (معاذ اللہ) ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ بلاسود معیشت کا تصور بھی احمقانہ ہے (نقلِ کفر کفر نباشد) نظروں سے اوجھل ہی سہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ پرانے زمانے کا سود جو انفرادی طور پر لیا جاتا تھا ایک فرد یا ایک گھرانے کو تباہ و برباد کرتا تھا' آج قرض صنعتکار' سرمایہ دار اور حکومتیں لیتی ہیں' سود در سود قوم کے ہر فرد کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ بنک میں سٹاک رہن سرمایہ دار رکھتا ہے جس سے مارکیٹ میں سٹاک کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ نتیجہ میں پیدا ہونے والی مہنگائی غریب کی گردن پر لاد دی جاتی ہے۔

سماجی سطح پر جائزہ لے لیں۔ پہلے عورتیں کنیزیں بنالی جاتی تھیں۔ اندرونِ خانہ عورتوں کی بے حرمتی کی جاتی تھی۔ آج آزادیٔ نسواں کے نام پر اُنہیں بے لباس اور برہنہ کر کے شمعِ محفل بنا دیا گیا ہے۔ اُن کی عریاں تصاویر چوکوں میں آویزاں کی جاتی ہیں' یعنی عورت کے حسن اور اُس کی نسوانی نزاکت کو تجارت کے فروغ کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ قانونی اجازت کے ساتھ اُن کی البم ہوٹلوں کو فراہم کی جاتی ہے۔ جسم فروش عورتوں کو طوائف کا نام دینے کی بجائے sex workers کا نام دے کر اسے باقاعدہ ایک عام کاروبار کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ ہم جنس

پرستی بھی جہالتِ قدیمہ کے آثار کے طور پر کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ دورِ جدید میں یہ بے غیرت جلوس نکالتے ہیں اور بعض نام نہاد مہذب سوسائٹیاں اسمبلیوں میں اسے قانونی حیثیت دینے کے لیے کوشاں ہے۔ گویا جنسی بے راہ روی کے حوالہ سے تو یہ جدید تہذیب دنیا کو شرم وحیا کا قبرستان بنا چکی ہے۔ فحاشی' بے حیائی اور عریانی کو یوں گھر گھر میں داخل کر دیا گیا ہے کہ غضِ بصر انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔ مرد کے مساوی مقام اور شانہ بشانہ کام کرنے کا دلفریب جھانسہ دے کر عورت کو معاشی حیوان بھی بنا دیا گیا ہے۔

بدترین استحصال اور ظلم آج کے دور میں سیاسی سطح پر ہو رہا ہے۔ جرمنی کے ہٹلر کو بدترین گالیوں سے نوازا گیا۔ اُسے اور نازیوں کو نفرت کا سمبل تو بنا دیا گیا لیکن ہٹلر ہی کے نازی وزیرِ خارجہ گوئبلز کی سیاست کو آئیڈیل بنا لیا گیا ہے۔ گوئبلز کا ایمان اور عقیدہ تھا کہ جھوٹ اتنا زیادہ بولو اور اتنے تسلسل سے اور زوردار انداز میں بولو کہ سچ اُس کے سامنے دب جائے۔ یقین کیجئے کہ جدید ترقی یافتہ نام نہاد مہذب مغربی معاشرہ نے اِس فیلڈ میں بعض معاملات میں اپنے مفادات کے حصول کے لیے گوئبلز کو بھی مات دے دی ہے۔ گوئبلز اکیلا تھا یا شاید اُس کے چند ساتھی ہوں' لیکن آج پورا مغربی میڈیا اپنی حکومتوں کے اشارے پر یہ فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ اِس حوالہ سے ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ نائن الیون کے بعد صرف دہشت گردی کا معاملہ لے لیں' یہودیوں اور عیسائیوں نے مسلمان حکمرانوں کی مدد سے کس طرح سیاہ نہیں گہرے سیاہ کو سفید ثابت کیا اور کیسے صاف اور اُجلے دامنوں کو کیمرہ ٹرک (Trick) سے دنیا کو داغدار اور گندا دکھایا۔ دہشت گرد اور انتہا پسند کے الفاظ کا اتنا شور وغوغا کیا گیا کہ کانوں کے پردے جواب دے گئے۔

ہم چاہتے ہیں کہ جہالت قدیمہ اور جدیدہ کے عنوان کے تحت مغرب کی ان دو اصطلاحات سے بھی دو دو ہاتھ کر لیے جائیں۔ انتہا پسند (یعنی مغرب کا extremist) ہمارا اپنا بیوروکریٹ اور ضرورت سے زیادہ پڑھا لکھا طبقہ یہ لفظ ناک اوپر کو چڑھا کر اور ہونٹ ٹیڑھے کر کے نفرت انگیز لہجے میں بولتا ہے۔ ہم اِس بارے میں اپنی مختصر سی رائے دیتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات' نبی آخر الزماں ﷺ کی مبارک سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے افعال ہمارے لیے حجت کا درجہ رکھتے ہیں' جو اعتدال اور توازن کی معراج ہیں۔ اِس سے کم' اِس سے زیادہ' اِس کے علاوہ سب انتہا پسندی ہے۔ اگر اللہ کے احکامات کی پابندی اور سنت رسولؐ کی پیروی (جس میں مختلف شکلوں میں جہاد بھی شامل ہے) انتہا پسندی ہے تو ہم دل کی گہرائیوں سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہر مسلمان کو انتہا پسند بنا دے۔ اے اللہ! انتہا پسندی



ہمارا مقدر بنا دے۔ رہ گئی بات دہشت گردی کی تو پہلے دہشت گرد کی تعریف تو متعین کر لیں۔ دہشت گرد کون ہوتا ہے؟ کسے کس عمل کے بعد دہشت گرد قرار دیا جائے گا؟ عملی طور پر امریکہ اور مغرب کا رویہ تو یہ ہے کہ وہ خود بمباری کرے توپوں کے گولے برسا کر ہنسی بستی انسانی آبادیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دے' ڈیزی کٹر بموں سے انسانی جسموں کے پرزے اُڑا دے' انسانوں کو پنجروں میں بند کر کے اُن سے درندوں والا سلوک کرے' دوسری قوموں اور ملکوں پر بلا جواز اور ناجائز غاصبانہ قبضہ کرے' تو اس جارح ملک کے سربراہ کو امن کا نوبل پرائز دیا جاتا ہے' کیونکہ یہ سب کچھ امن کی خاطر ہے' بلکہ یہی امن ہے۔ اور اگر متاثرہ قوم یا افراد ردِعمل میں ہتھیار اُٹھائیں' ظلم کے خلاف ڈٹ جائیں اور جوابی حملے کریں اور اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جدّوجُہد کریں تو یہ دہشت گردی ہے اور ایسا کرنے والے دہشت گرد ہیں۔ ہم کسی قیمت پر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ہماری رائے میں اول الذّکر ممالک کی یہ ریاستی دہشت گردی ہے اور انتہائی قابلِ نفرت اور قابلِ مذمت ہے۔ سیدھی سی بات ہے' بلاتفریق مذہب ونسل ہر انسان کی جان محترم ہے اور کسی کا بلاوجہ بلاجواز اور بلامقصد خون نہیں بہایا جا سکتا۔ کوئی فرد' کوئی ادارہ یا کوئی حکومت محض ملک گیری کی ہوس میں کسی اعلیٰ وارفع مقصد کے بغیر جنگ وجدل کا بازار گرم کرتی ہے تو یہ دہشت گردی ہے۔ جس قوم اور ملک پر یہ دہشت گردی مسلّط کی جائے گی تو اُس کے صاحبِ اقتدار اور مقتدر لوگوں کا قومی اور دینی فریضہ ہے کہ وہ جوابی کارروائی کریں اور وہ حکومت یہ فیصلہ کرنے کا حق بھی رکھتی ہے کہ وہ اپنی مدد کے لیے کہاں سے اور کن افراد سے مدد حاصل کرتی ہے۔ اور اگر اُس ملک کی حکومت اپنا یہ فریضہ ادا نہیں کرتی اور دشمن کے ایجنٹ کا رول ادا کرتی ہے تو پھر عوام کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اپنے اِن دونوں دشمنوں کے تسلّط سے نجات حاصل کرنے کے لیے جہاد کس انداز سے کریں۔

بہرحال ہمارا اصل موضوع جہالتِ قدیمہ اور جہالتِ جدیدہ تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جہالت ہر دور اور ہر طرح کی قابل مذمت اور قابلِ نفرت ہے' لیکن جہالتِ جدیدہ انسان پر ظلم وستم ڈھانے اور اُسے انفرادی اور اجتماعی طور پر تباہ وبرباد کرنے میں جہالتِ قدیمہ سے بازی لے گئی ہے اور اِس کا انجام کسی خطے کی نہیں عالمی سطح پر تباہی وبربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ اپنے اور اپنے بندوں کے دشمنوں کو ہدایت دے اور اگر ہدایت اُن کی قسمت میں نہیں تو اِس سے پہلے کہ وہ عالمی سطح پر تباہی پھیلائیں وہ خود تباہ وبرباد ہو جائیں۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

# سُورۃُ الکَھف

## آیات ۵۰ تا ۵۳

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۝ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ۝

**آیت ۵۰** ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ﴾ ’’اور یاد کرو جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ سجدہ کرو آدمؑ کو‘ تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے (نہ کیا)۔‘‘

یہاں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف کی مشابہت کے سلسلے میں یہ اہم بات نوٹ کیجیے کہ سورۃ الکہف کے ساتویں رکوع کی پہلی آیت کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو سورۂ بنی اسرائیل کے ساتویں رکوع کی پہلی آیت کے ہیں۔ حضرت آدمؑ اور ابلیس کا یہ قصہ قرآن میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے۔ باقی چھ مقامات پر تو اس کا ذکر نہیں مگر یہاں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ابلیس جِنّات میں سے تھا:



﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ﴾ ’’وہ جِنّات میں سے تھا‘ چنانچہ اُس نے نافرمانی کی اپنے رب کے حکم کی۔‘‘

یہاں پر ’’ف‘‘ علت کو ظاہر کر رہا ہے کہ چونکہ وہ جِنّات میں سے تھا اس لیے نافرمانی کا مرتکب ہوا۔ ورنہ فرشتے کبھی اپنے رب کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے: ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾ (التحریم) ’’وہ (فرشتے) اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے وہ جو بھی حکم انہیں دے اور وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔‘‘

﴿اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ﴾ ’’تو کیا تم بناتے ہو اُسے اور اُس کی اولاد کو دوست میرے سوا‘ درآنحالیکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟‘‘

اے اولادِ آدمؑ! ذرا سوچو‘ تم مجھے چھوڑ کر اس ابلیس کو اپنا ولی اور کارساز بناتے ہو جس نے یوں میری نافرمانی کی تھی۔ تمہارا خالق اور مالک میں ہوں‘ میں نے تمہیں اشرف المخلوقات کے مرتبے پر فائز کیا‘ میں نے فرشتوں کو تمہارے سامنے سرنگوں کیا‘ تمہیں خلافت ارضی سے نوازا‘ اور تم ہو کہ میرے مقابلے میں ابلیس اور اس کی صلبی و معنوی اولاد سے دوستیاں گانٹھتے پھرتے ہو‘ جبکہ فی الواقع وہ تمہارے دشمن ہیں۔

﴿بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝﴾ ’’کیا ہی برا بدل ہے ان ظالموں کے لیے!‘‘

اللہ کو چھوڑ کر اپنے دشمن شیطان اور اس کے چیلوں کی رفاقت اختیار کر کے ان ظالموں نے اپنے لیے کس قدر برا بدل اختیار کر رکھا ہے۔

**آیت ۵۱** ﴿مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠﴾ ’’میں نے انہیں گواہ نہیں بنایا تھا آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا اور نہ ہی ان کی اپنی تخلیق کا‘‘

﴿وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝﴾ ’’اور میں بہکانے والوں کو اپنا مددگار بنانے والا نہ تھا۔‘‘

یہ جو تم شیطان اور اس کے گروہ کو میرے برابر لا رہے ہو اور مجھے چھوڑ کر انہیں اپنا دوست بنا رہے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ زمین و آسمان کی تخلیق اور خود اپنی تخلیق کے موقع کے گواہ نہیں ہیں۔

**آیت ۵۲** ﴿وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ﴾ ’’اور جس دن وہ کہے گا

کہ پکارو میرے ان شریکوں کو جن کا تمہیں زعم تھا‘‘

﴿فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَوْبِقًا ﴿٥٢﴾﴾ ’’تو وہ انہیں پکاریں گے مگر وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور ہم ان کے درمیان ہلاکت (کی گھاٹی) حائل کر دیں گے۔‘‘

یہ شریک ٹھہرائی جانے والی شخصیات چاہے انبیاء ہوں‘ اولیاء اللہ ہوں یا فرشتے‘ روزِ قیامت ان کے اور انہیں شریک ماننے والوں کے درمیان ہلاکت خیز خلیج حائل کر دی جائے گی تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ ان کی مدد کو نہیں آ سکتے۔

**آیت ۵۳** ﴿وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿٥٣﴾﴾ ’’اور مجرم لوگ آگ کو دیکھیں گے اور جان جائیں گے کہ وہ اس میں ڈالے جانے والے ہیں اور وہ نہیں پائیں گے اس سے بچنے کی کوئی جگہ۔‘‘

## آیات ۵۴ تا ۵۹

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنذِرُوا هُزُوًا ﴿٥٦﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ۚ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِن تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ فَلَن يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ﴿٥٧﴾ وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِن دُونِهِ مَوْئِلًا ﴿٥٨﴾ وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِم مَّوْعِدًا ﴿٥٩﴾

**آیت ۵۴** ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ﴾ ’’اور ہم نے پھیر



پھیر کر بیان کر دی ہیں اس قرآن میں لوگوں (کی ہدایت) کے لیے ہر قسم کی مثالیں۔‘‘

الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ آیت سورۂ بنی اسرائیل میں بھی (آیت ۸۹) موجود ہے۔

﴿وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾﴾ ’’لیکن انسان تمام مخلوق سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔‘‘

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۹ کے پہلے حصے کے الفاظ جوں کے توں وہی ہیں جو اس آیت کے پہلے حصے کے ہیں‘ صرف لفظوں کی ترتیب میں معمولی سا فرق ہے۔ البتہ دونوں آیات کے آخری حصوں کے الفاظ مختلف ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیت کا آخری حصہ یوں ہے: ﴿فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ﴿٨٩﴾﴾ ’’مگر اکثر لوگ کفرانِ نعمت پر ہی اڑے رہتے ہیں۔‘‘

**آیت ۵۵** ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ﴾ ’’اور نہیں روکا لوگوں کو (کسی چیز نے) جب ان کے پاس ہدایت آ گئی کہ وہ ایمان لائیں اور اپنے رب سے مغفرت مانگیں‘‘

اس آیت کی مشابہت سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۹۴ کے ساتھ ہے۔ دونوں آیات کے پہلے حصوں کے الفاظ ہو بہو ایک جیسے ہیں۔

﴿إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ﴾ ’’مگر یہ کہ اُن سے پہلوں کا طریق برتا جائے‘‘

یہ لوگ جو ہدایت آ جانے کے بعد بھی ایمان نہیں لا رہے اور اللہ کے حضور استغفار نہیں کر رہے ہیں تو اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کے لیے بھی پہلی قوموں کا سا انجام لکھا جا چکا ہے۔

﴿أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾﴾ ’’یا عذاب اُن کے سامنے آ موجود ہو۔‘‘

**آیت ۵۶** ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ﴾ ’’اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر خوشخبری دینے والے اور خبردار کرنے والے (بنا کر)‘‘

یہ مضمون جو یہاں سب رسولوں کے متعلق جمع کے صیغے میں آیا ہے‘ سورۂ بنی اسرائیل میں حضور ﷺ کے لیے صیغۂ واحد میں یوں آیا ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾ ’’

اور (اے محمد ﷺ!) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر مبشر اور نذیر بنا کر۔''

﴿وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ﴾ ''اور یہ کافر لوگ جھگڑتے ہیں جھوٹ کی طرف سے تاکہ بچلا دیں اس کے ساتھ حق کو''

یہ لوگ باطل کے ساتھ کھڑے ہو کر حق کو شکست دینے کے لیے مناظرے اور کٹ حجتیاں کر رہے ہیں۔

﴿وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿٥٦﴾﴾ ''اور انہوں نے میری آیات کو اور (اس چیز کو) جس کے ساتھ انہیں خبردار کیا گیا تھا مذاق بنا لیا ہے۔''

**آیت ۵۷** ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ﴾ ''اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے نصیحت کی گئی ہو اُس کے رب کی آیات کے ذریعے' تو اس نے اعراض کیا اُن سے اور وہ بھول گیا کہ کیا آگے بھیجا ہے اس کے دونوں ہاتھوں نے۔''

بجائے ایمان لانے کے اور اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کرنے کے اس نے اللہ کی آیات سے روگردانی کی روش اپنائے رکھی۔ اس ضد اور ہٹ دھرمی میں وہ اپنے اعمال کے اس جھاڑ جھنکاڑ کو بھی بھول گیا جو اُس نے اپنی آخرت کے لیے تیار کر رکھا تھا۔

﴿اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ ''یقیناً ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ اس (قرآن) کو سمجھ نہ پائیں اور ان کے کانوں میں بوجھ (ڈال دیا ہے)۔''

یہ مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں اس طرح آچکا ہے: ﴿وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿٤٥﴾﴾ ''اور جب آپؐ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے لوگوں کے درمیان پردہ حائل کر دیتے ہیں۔''

﴿وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿٥٧﴾﴾ ''اور اگر چہ آپؐ بلائیں انہیں ہدایت کی طرف تب بھی وہ کبھی ہدایت نہیں پائیں گے۔''

کیونکہ حق واضح ہو جانے بعد ان کی مسلسل ہٹ دھرمی کے سبب ان کے دلوں پر مہریں



لگ چکی ہیں اور اس طرح وہ اللہ کے قانونِ ہدایت وضلالت کی آخری دفعہ کی زد میں آچکے ہیں جس کے تحت جان بوجھ کر حق سے اعراض کرنے والے کو ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

**آیت ۵۸** ﴿وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ﴾ ''اور آپؐ کا رب بہت بخشنے والا' بہت رحمت والا ہے۔ اگر وہ مواخذہ کرتا ان کا بسبب ان کے اعمال کے تو بہت جلدی بھیج دیتا ان پر عذاب۔''

یہ مضمون سورۃ النحل' آیت ۶۱ اور سورۂ فاطر' آیت ۴۵ میں بھی بڑی وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ظلم اور برے اعمال کے سبب ان کا مؤاخذہ کرتا تو روئے زمین پر کوئی متنفس زندہ نہ بچتا۔

﴿بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿٥٨﴾﴾ ''بلکہ ان کے لیے وعدے کا ایک وقت معین ہے اور وہ ہرگز نہیں پائیں گے اس کے سوا بچنے کی کوئی جگہ۔''

جب کسی کے وعدے کی مقررہ گھڑی (اجل) آپہنچے گی تو اسے کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی اور اس کے لیے اس سے سرک کر اِدھر اُدھر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی: ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾﴾ (النحل) ''پھر جب آجاتا ہے اُن کا وقت معین تو نہ وہ پیچھے رہ سکتے ہیں ایک لمحہ اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔''

**آیت ۵۹** ﴿وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا﴾ ''اور یہ ہیں وہ بستیاں جن (کے باسیوں) کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم اختیار کیا''

اَحقاف میں آباد قومِ عاد کے افراد ہوں یا علاقۂ حجر کے باشندے' اصحاب الایکہ ہوں یا عامورہ اور سدوم کے باسی' سب اسی قانونِ الٰہی کے مطابق ہلاکت سے دوچار ہوئے۔

﴿وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿٥٩﴾﴾ ''اور ہم نے مقرر کر دیا تھا ان کی ہلاکت کے لیے وعدے کا ایک وقت۔''

وعدے کے اس طے شدہ وقت سے پہلے کسی قوم یا بستی پر کبھی کوئی عذاب نہیں آیا۔

# آیات ۶۰ تا ۸۲

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۝۶۰
فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ۝۶۱ فَلَمَّا
جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ۝۶۲ قَالَ
اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ
اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ۝۶۳ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا
عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۝۶۴ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا
وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝۶۵ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا
عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝۶۶ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۶۷ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ
تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۝۶۸ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ۝۶۹
قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝۷۰
فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ
اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ۝۷۱ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ
صَبْرًا ۝۷۲ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝۷۳
فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ
لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ۝۷۴ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۷۵
قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ
عُذْرًا ۝۷۶ فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨاسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ
يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ
لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝۷۷ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا
لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۷۸ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ
فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝۷۹ وَاَمَّا



الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝۸۰ فَاَرَدْنَآ
اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ۝۸۱ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ
لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ
فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا
فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۸۲

ان دو رکوعوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک سفر کا ذکر ہے۔ اس واقعہ کا ذکر احادیث میں بھی ملتا ہے اور قدیم اسرائیلی روایات میں بھی، جن میں سے بہت سی روایات قرآن کے بیان سے مطابقت بھی رکھتی ہیں۔ بہرحال ان روایات سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپؑ فلاں جگہ جائیں، وہاں پر آپؑ کو ہمارا ایک صاحبِ علم بندہ ملے گا، آپؑ کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہ کر اس کے علم سے استفادہ کریں۔ ممکن ہے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا ابتدائی زمانہ ہو اور اس طریقے سے آپؑ کی تربیت مقصود ہو، جس طرح بعض روایات سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ کی تربیت کے لیے ایک فرشتہ تین سال تک مسلسل آپؐ کے ساتھ رہا۔

اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جس بندے کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں قطعی معلومات دستیاب نہیں۔ اس ضمن میں ایک رائے تو یہ ہے کہ وہ ایک فرشتہ تھے، جبکہ ایک دوسری رائے کے مطابق وہ انسان ہی تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بہت لمبی عمر دے رکھی ہے۔ یعنی جیسے جنوں میں سے ابلیس کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا کر رکھی ہے ایسے ہی اُس نے انسانوں میں سے اپنے ایک نیک اور برگزیدہ بندے کو بھی بہت طویل عمر سے نوازا ہے اور ان کا نام حضرت خضر ہے۔ (واللہ اعلم!)

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی وقت یہ خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے شاید مجھے روئے زمین کے تمام انسانوں سے بڑھ کر علم عطا فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ پر یہ واضح کرنے کے لیے کہ ﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ آپؑ کو ہدایت فرمائی کہ آپ فلاں جگہ ہمارے ایک بندۂ خاص سے ملاقات کریں اور کچھ عرصہ اُس کے ساتھ رہ کر اُس سے علم و حکمت سیکھیں۔ اس حکم کی تعمیل میں آپؑ اپنے نوجوان ساتھی حضرت یوشع بن نون کو ساتھ لے کر سفر پر روانہ ہو گئے۔

**آیت ۶۰** ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ۶۰﴾ ''اور یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنے نوجوان (ساتھی) سے کہا کہ میں (چلنا) نہیں چھوڑوں گا' یہاں تک کہ دو دریاؤں کے ملنے کے مقام پر پہنچ جاؤں یا میں برسوں چلتا ہی رہوں گا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کو بتایا گیا تھا کہ وہ شخص مجمع البحرین (دو دریاؤں کے سنگم) پر ملے گا۔ مجمع البحرین کے اس مقام کے بارے میں بھی مفسرین کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ بحیرۂ احمر (Red Sea) کے شمالی کونے سے نکلنے والی دو کھاڑیوں (خلیج سویز اور خلیج عقبہ) کے مقامِ اتصال کو مجمع البحرین کہا گیا ہے' جبکہ ایک دوسری رائے کے مطابق (اور یہ رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے) یہ مقام دریائے نیل پر واقع ہے۔ دریائے نیل دو دریاؤں یعنی النیل الازرق اور النیل الابیض سے مل کر بنا ہے۔ یہ دونوں دریا سوڈان کی طرف سے مصر میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک دریا کے پانی کا رنگ نیلا ہے جبکہ دوسرے کا سفید ہے (پاکستان میں بھی اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کے صاف پانی اور دریائے کابل کے گدلے پانی کا ملاپ ایسا ہی منظر پیش کرتا ہے)۔ چنانچہ اس رائے کے مطابق جس مقام پر یہ دونوں دریا مل کر ایک دریا (مصر کے دریائے نیل) کی شکل اختیار کرتے ہیں اس مقام کو مجمع البحرین کہا گیا ہے اور یہ مقام خرطوم کی سرحد کے آس پاس ہے۔

**آیت ۶۱** ﴿فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَیْنِهِمَا﴾ ''پھر جب وہ دونوں پہنچ گئے دو دریاؤں کے ملنے کے مقام پر''

﴿نَسِیَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا ۶۱﴾ ''تو وہ اپنی مچھلی کو بھول گئے اور اس (مچھلی) نے اپنا راستہ بنا لیا تھا دریا میں سرنگ کی طرح۔''

یہ بھنی ہوئی مچھلی تھی جس کو وہ کھانے کی غرض سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس مچھلی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانی بنایا گیا تھا اور انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ جس مقام پر یہ مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی جائے گی اسی جگہ مطلوبہ شخصیت سے ان کی ملاقات ہو گی۔ چنانچہ مجمع البحرین کے قریب پہنچ کر وہ مچھلی زندہ ہو کر ان کے توشہ دان سے باہر آئی اور اُس نے سرنگ سی بنا کر دریا میں اپنی راہ لی۔ اس منظر کو حضرت یوشع بن نون نے دیکھا بھی مگر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کا تذکرہ کرنا بھول گئے۔



**آیت ۶۲** ﴿فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ۶۲﴾ ''پھر جب وہ دونوں (وہاں سے) آگے نکل گئے تو موسیٰؑ نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اب ہمارا ناشتہ لے آؤ' اپنے اس سفر سے تو ہمیں بہت تکان ہو گئی ہے۔''

یہاں مفسرین نے ایک بہت اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ آپؑ کو تھکاوٹ اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ آپؑ مطلوبہ مقام سے آگے نکل گئے تھے۔ ورنہ اس مقام تک پہنچنے میں آپؑ کو کسی قسم کی تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوا تھا۔

**آیت ۶۳** ﴿قَالَ اَرَءَیْتَ اِذْ اَوَیْنَآ اِلَی الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ ۫﴾ ''اُس (نوجوان) نے کہا: دیکھئے' جب ہم ٹھہرے تھے چٹان کے پاس تو میں بھول گیا مچھلی کو (نگاہ میں رکھنا)''

﴿وَمَآ اَنْسٰىنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ۶۳﴾ ''اور نہیں مجھے بھلائے رکھا مگر شیطان نے کہ میں (آپؑ سے) اس کا ذکر کروں' اور اُس نے تو بنا لیا تھا اپنا راستہ دریا میں عجیب طرح سے۔''

یعنی اس جگہ وہ مچھلی زندہ ہو کر عجیب طریقے سے دریا میں چلی گئی تھی۔

**آیت ۶۴** ﴿قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۫﴾ ''موسیٰؑ نے کہا: یہی تو تھا جس کی ہمیں تلاش تھی!''

یہی تو ہمیں نشانی بتائی گئی تھی کہ جس جگہ مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی جائے گی اس جگہ پر اللہ کے اس بندے سے ہماری ملاقات ہو گی۔ چنانچہ چلو اب واپس اسی جگہ پر پہنچیں۔

﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۶۴﴾ ''پس وہ دونوں واپس لوٹے اپنے نقوشِ پا کو دیکھتے ہوئے۔''

واپس اپنے قدموں کے نشانات پر چلتے ہوئے وہ عین اسی جگہ پر آ گئے جہاں چٹان کے پاس مچھلی زندہ ہو کر دریا میں کود گئی تھی۔

**آیت ۶۵** ﴿فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۶۵﴾ ''تو پایا انہوں نے (وہاں) ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو جسے ہم نے رحمت عطا کی تھی اپنی طرف سے اور اسے سکھایا تھا ایک علم خاص اپنے پاس سے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس سے' اپنے خاص خزانۂ فیض سے اسے خصوصی علم عطا کر رکھا

تھا۔ ''علم لدنی'' کی اصطلاح یہیں سے اخذ کی گئی ہے۔ لَدُن کے معنی قریب یا نزدیک کے ہیں۔ چنانچہ علم لدنی سے مراد وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت سے کسی کو عطا کر دے۔ یعنی ایک علم تو وہ ہے جو انسان اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے سے باقاعدہ محنت و مشقت کے عمل سے گزر کر حاصل کرتا ہے' جیسے مدارسِ عربیہ میں صرف و نحو' تفسیر و حدیث اور فقہ وغیرہ علوم حاصل کیے جاتے ہیں' یا سکول و کالج میں متداول عمرانی و سائنسی علوم سیکھے جاتے ہیں' لیکن علم کی ایک قسم وہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ براہِ راست کسی انسان کے دل میں ڈال دیتا ہے اور اُس کو اُس کی تحصیل کے لیے کوئی مشقت وغیرہ بھی نہیں اٹھانی پڑتی۔

**آیت ۶۶** ﴿قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾﴾ ''موسیٰؑ نے اُس سے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں اس شرط پر کہ آپ مجھے سکھائیں اُس میں سے جو بھلائی آپ کو سکھائی گئی ہے؟''

مجھے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس نے آپ کو خاص حکمت اور دانائی عطا کر رکھی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرصہ آپ کے ساتھ رہوں اور آپ مجھے بھی اس علم خاص میں سے کچھ سکھا دیں۔

**آیت ۶۷** ﴿قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾﴾ ''اُس نے کہا: میرے ساتھ (رہ کر) آپؑ ہرگز صبر نہیں کر سکیں گے۔''

**آیت ۶۸** ﴿وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰي مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾﴾ ''اور آپؑ کیسے صبر کریں گے اُس چیز پر جس کی آپ کو پوری پوری خبر نہیں!''

میرے ساتھ رہ کر آپ کو میرے کام بڑے عجیب لگیں گے اور آپ صبر نہیں کر پائیں گے' کیونکہ اُن کاموں کی حقیقی غرض و غایت کے بارے میں آپ کو پوری طرح آگاہی حاصل نہیں ہوگی۔ جو باتیں آپ کے دائرۂ علم سے باہر ہوں گی ان پر آپ کیسے صبر کر پائیں گے!

**آیت ۶۹** ﴿قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾﴾ ''موسیٰؑ نے کہا: آپ مجھے ان شاء اللہ صابر پائیں گے' اور میں خلاف ورزی نہیں کروں گا آپ کے کسی حکم کی۔''

یہاں پر ایک اہم نکتہ لائق توجہ ہے کہ جب صبر کرنے کی بات ہوئی تو اس کے ساتھ



حضرت موسیٰؑ نے ان شاء اللہ کہا' لیکن نافرمانی نہ کرنے کے وعدے کے ساتھ 'ان شاء اللہ' نہیں کہا۔ چنانچہ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ اسی وعدے کی خلاف ورزی آپؑ سے ہوئی جس کے ساتھ ان شاء اللہ نہیں کہا گیا تھا۔ اس حوالے سے اسی سورت کا وہ حکم بھی ذہن میں رکھیے جس میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾﴾ ''اور کسی چیز کے بارے میں یہ کبھی نہ کہا کریں کہ میں کل یہ کرنے والا ہوں مگر یہ کہ اللہ چاہے'' اور اپنے رب کو یاد کر لیا کیجیے جب آپؐ بھول جائیں اور کہیے کہ ممکن ہے میرا رب میری راہنمائی کر دے اس سے زیادہ بھلائی کی راہ کی طرف۔''

**آیت ۷۰** ﴿قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾﴾ ''اُس نے کہا: اگر آپ میرے ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو کسی چیز کے بارے میں مجھ سے خود نہ پوچھنا یہاں تک کہ میں خود ہی آپ کو اس کے بارے میں بتا دوں۔''

بس آپ میرے ساتھ ساتھ رہیں اور میں جو کچھ کروں یا میرے ساتھ جو کچھ ہو آپ خاموشی سے اس کا مشاہدہ کرتے رہیں' مگر کسی چیز کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کریں۔ میں جب مناسب سمجھوں گا اُن تمام چیزوں کی حقیقت اور تفصیل آپ کو بتا دوں گا جو آپ کے مشاہدے میں آئی ہوں گی۔

**آیت ۷۱** ﴿فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ﴾ ''پھر وہ دونوں چل پڑے' یہاں تک کہ جب وہ دونوں سوار ہوئے ایک کشتی میں' تو اُس نے اس (کشتی) میں شگاف ڈال دیا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی سوال نہ کرنے والی شرط تسلیم کر لی اور یوں وہ دونوں سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب وہ دریا پار کرنے کے لیے ایک کشتی میں سوار ہوئے تو انہوں (اُن کو صاحب موسیٰؑ کہیں یا حضرت خضر کہیں) نے بیٹھتے ہی کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو آپؑ کہاں خاموش رہنے والے تھے' فوراً ان کو ٹوک دیا۔

﴿قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾﴾ ''موسیٰؑ نے کہا: کیا

آپ نے اسے پھاڑ ڈالا ہے تاکہ غرق کر دیں اس کے تمام سواروں کو؟ یہ تو آپ نے بہت ہی غلط کام کیا ہے۔''

**آیت ۷۲** ﴿قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۷۲﴾ ''اس نے کہا: میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے؟''

اس قصہ میں مذکور تین واقعات کے حوالے سے ایک اہم بات سمجھنے کی یہ ہے کہ اللہ کے جن احکام کے مطابق اس کائنات کا نظام چل رہا ہے' ان کی حیثیت تشریعی (شریعت سے متعلق) نہیں بلکہ تکوینی (کائنات کے انتظامی امور سے متعلق) ہے۔ ان احکام کی تنفیذ کے لیے فرشتے مقرر ہیں۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی رائے یہ بھی ہے کہ اس مقصد کے لیے اولیاء اللہ کی ارواح کو بھی ملائکہ کے طبقہ اسفل میں شامل کر دیا جاتا ہے اور وہ بھی فرشتوں کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ میں حصہ لیتے ہیں۔ بہر حال ان تکوینی احکام کی تعمیل کے نتیجے میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں ہم ان کے صرف ظاہری پہلوؤں کو ہی دیکھ سکتے ہیں۔ کسی واقعہ کے پیچھے اللہ کی مشیت کیا ہے؟ اس کا ادراک ہم نہیں کر سکتے۔ ضروری نہیں کہ کوئی واقعہ یا کوئی چیز بظاہر جیسے دکھائی دے اس کی حقیقت بھی ویسی ہی ہو۔ ممکن ہے ہم کسی چیز کو اپنے لیے برا سمجھ رہے ہوں مگر اس کے اندر ہمارے لیے خیر ہو اور جس چیز کو اچھا سمجھ رہے ہوں' وہ حقیقت میں اچھی نہ ہو۔ سورۃ البقرۃ میں ہم یہ آیت پڑھ چکے ہیں: ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶﴾ ''ہوسکتا ہے تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو' اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن کو تفویض الامر کا رویہ اپنانا چاہیے کہ اے اللہ! میرا معاملہ تیرے سپرد ہے' میرے لیے جو تو پسند کرے گا میں اسی پر راضی رہوں گا' کیونکہ تیرے ہاتھ میں خیر ہی خیر ہے: ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ﴾ (آل عمران ۲۶)۔

**آیت ۷۳** ﴿قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝۷۳﴾ ''موسیٰؑ نے کہا: آپ میرا مؤاخذہ نہ کیجیے میرے بھول جانے پر اور نہ ہی میرے معاملے میں زیادہ سختی کیجیے۔''



میں بھول گیا تھا کہ آپ سے میں نے سوال نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے' لہٰذا آپ میری اس بھول کی وجہ سے میرا مؤاخذہ نہ کریں اور درگزر سے کام لیں۔

**آیت ۷۴** ﴿فَانْطَلَقَا ۠ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ﴾ ''پھر وہ دونوں چل پڑے' یہاں تک کہ ان کی ملاقات ہوئی ایک لڑکے سے تو اُس (خضر) نے اس کو قتل کر دیا''

﴿قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ﴾ ''موسیٰؑ نے کہا: کیا آپ نے قتل کر دیا ایک معصوم جان کو بغیر کسی جان کے (بدلے کے)؟''

اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا' کسی کا خون نہیں بہایا تھا' پھر بھی آپ نے اسے قتل کر دیا۔

﴿لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا نُّكْرًا ۝۷۴﴾ ''یہ تو آپ نے بہت ہی نامعقول حرکت کی ہے۔''

**آیت ۷۵** ﴿قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۷۵﴾ ''اس (خضر) نے کہا: کیا میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے؟''

**آیت ۷۶** ﴿قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ﴾ ''موسیٰؑ نے کہا: اگر میں آپ سے سوال کروں کسی چیز کے بارے میں اس کے بعد تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیے گا۔''

ایک دفعہ پھر آپ میری اس بھول کو نظر انداز کر دیں' لیکن اگر تیسری مرتبہ ایسا ہوا تب بے شک آپ مجھے اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیں۔

﴿قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝۷۶﴾ ''آپ پہنچ چکے ہیں میری طرف سے حدِ عذر کو۔''

یعنی آپ کی طرف سے مجھ پر حجت قائم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس کے بعد آپ مجھے ساتھ نہ رکھنے کے بارے میں عذر کر سکتے ہیں۔

**آیت ۷۷** ﴿فَانْطَلَقَا ۠ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا﴾ ''پھر وہ دونوں چل پڑے' یہاں تک کہ جب پہنچے ایک بستی کے لوگوں کے پاس تو انہوں نے کھانا مانگا بستی والوں سے''

کہ ہم مسافر ہیں' بھوکے ہیں' ہمیں کھانا چاہیے۔

﴿فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا﴾ ''تو انہوں نے انکار کر دیا ان دونوں کی

مہمان نوازی سے‘‘

اس بستی کے باشندے کچھ ایسے کٹھور دل تھے کہ پوری بستی میں سے کسی ایک شخص نے بھی انہیں کھانا کھلانے کی حامی نہ بھری۔

﴿فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ﴾ ’’تو ان دونوں نے وہاں ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی تو اُس (خضر) نے اسے سیدھا کر دیا۔‘‘

﴿قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝۷۷﴾ ’’موسیٰؑ نے کہا: اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لے لیتے۔‘‘

یہ ایسے نا ہنجار لوگ ہیں کہ انہوں نے ہمیں کھانا تک کھلانے سے انکار کر دیا تھا اور آپ نے بغیر کسی معاوضے کے ان کی دیوار مرمت کر دی ہے۔ بہتر ہوتا اگر آپ اس کام کی کچھ اجرت طلب کرتے اور اس کے عوض ہم کھانا ہی کھا لیتے۔

**آیت ۷۸** ﴿قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۷۸﴾ ’’اُس (خضر) نے کہا: بس اب یہ جدائی (کا وقت) ہے میرے اور آپ کے درمیان‘ اب میں آپ کو بتائے دیتا ہوں اصل حقیقت ان چیزوں کی جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔‘‘

**آیت ۷۹** ﴿اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ﴾ ’’جہاں تک اُس کشتی کا معاملہ ہے تو وہ غریب لوگوں کی (ملکیت) تھی جو محنت کرتے تھے دریا میں‘‘

وہ بہت غریب اور نادار لوگ تھے‘ صرف وہ کشتی ہی ان کے معاش کا سہارا تھی۔ اس کے ذریعے وہ لوگوں کو دریا کے آر پار لے جاتے اور اس مزدوری سے اپنا پیٹ پالتے تھے۔

﴿فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝۷۹﴾ ’’تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں‘ اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو پکڑ رہا تھا ہر کشتی کو زبردستی۔‘‘

بادشاہ ہر اُس کشتی کو اپنے قبضے میں لے لیتا تھا جو صحیح و سالم ہوتی تھی۔ ان نادار لوگوں کی کشتی بھی اگر بے عیب ہوتی تو بادشاہ ان سے زبردستی چھین لیتا۔ چنانچہ میں نے اس کا ایک تختہ توڑ کر اسے عیب دار کر دیا۔ اب جب بادشاہ اس عیب دار کشتی کو دیکھے گا تو اسے چھوڑ دے گا



اور اس طرح ان کی روزی کا واحد سہارا ان سے نہیں چھنے گا۔ پوری کشتی چھن جانے کے مقابلے میں ایک تختے کا ٹوٹ جانا تو معمولی بات ہے۔ اس تختے کی وہ لوگ آسانی سے مرمت کر لیں گے اور یوں وہ کشتی ان کی روزی کا ذریعہ بنی رہے گی۔ لہٰذا وہ تختہ ان لوگوں کی بھلائی کے لیے توڑا گیا تھا نہ کہ کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے۔

**آیت ۸۰** ﴿وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝۸۰﴾ ’’رہا وہ لڑکا! تو اس کے والدین دونوں مؤمن تھے‘ تو ہمیں خدشہ ہوا کہ وہ سرکشی اور ناشکری سے ان پر تعدی کرے گا۔‘‘

حضرت خضر کو اپنے خاص علم کی بنا پر معلوم ہوا ہو گا کہ اس بچے کے genes اچھے نہیں ہیں اور بڑا ہو کر اپنے والدین کے لیے سوہانِ روح ثابت ہو گا اور سرکشی اور ناشکری کی روش اختیار کر کے ان کو عاجز کر دے گا۔

**آیت ۸۱** ﴿فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ۝۸۰﴾ ’’پس ہم نے چاہا کہ ان دونوں کو بدلے میں دے ان کا رب اس سے بہتر (اولاد) پاکیزگی میں اور قریب تر شفقت میں۔‘‘

بچے کے والدین چونکہ نیک اور صالح لوگ تھے اس لیے ان کے رب نے چاہا کہ اس بچے کی جگہ انہیں ایک ایسا فرزند عطا فرمائے جو پاکیزہ نفسی و پرہیزگاری میں اس سے بہتر اور مروّت و دردمندی میں اس سے بڑھ کر ہو۔ چنانچہ وقتی طور پر تو بچے کے فوت ہونے سے والدین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو گا لیکن حقیقت میں یہ سب کچھ ان کی بہتری کے لیے ہی کیا گیا تھا۔

**آیت ۸۲** ﴿وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ﴾ ’’اور رہی وہ دیوار! تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی‘ اور اس کے نیچے خزانہ تھا ان دونوں کے لیے‘ اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔‘‘

باپ نے جب دیکھا ہو گا کہ میرا آخری وقت قریب آ لگا ہے اور میرے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں تو اس نے اپنی ساری پونجی اکٹھی کر کے دیوار کی بنیاد میں دفن کر دی ہو گی‘ اس امید پر کہ جب وہ بڑے ہوں گے تو نکال لیں گے۔ لیکن اگر وہ دیوار وقت سے پہلے ہی گر جاتی تو اس بستی کے نا ہنجار لوگ جو کسی مسافر کو کھانا کھلانے کے بھی روادار نہیں‘ ان یتیموں کا دفینہ لوٹ

کر لے جاتے۔

﴿فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ﴾ ''لہٰذا آپ کے رب نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور نکال لیں اپنا خزانہ''

باپ چونکہ نیک آدمی تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیوار کی مرمت کا اہتمام کر کے اس کے کمسن یتیم بچوں کی بھلائی کا سامان کیا گیا۔

﴿رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِىْ ۭ﴾ ''(یہ سب امور) آپ کے رب کی رحمت سے (طے ہوئے) تھے' اور میں نے اپنی رائے سے انہیں سرانجام نہیں دیا۔''

یعنی یہ تمام امور اللہ کی رحمت کا مظہر تھے۔ یہ اللہ ہی کے فیصلے تھے اور اسی کے حکم سے ان کی تنفیذ و تعمیل کی گئی۔ میں نے اپنی مرضی سے ان میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔ ان امور کے سلسلے میں اللہ کے احکام کی تنفیذ کرنے والے اللہ کے وہ بندے حضرت خضر تھے' کوئی اور ولی اللہ تھے یا کوئی فرشتہ تھے' اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اس سارے واقعہ میں اصل بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے ایسے تمام بندے کارکنانِ قضا و قدر کی فوج کے سپاہی ہیں اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے جن احکام کی تنفیذ کر رہے ہیں ان کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ تکوینی امور سے ہے۔ دنیا میں جو واقعات و حادثات رونما ہوتے ہیں ہم صرف ان کے ظاہری پہلو کو دیکھ کر ہی ان پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں یا دل گرفتہ ہوتے ہیں۔ بہر حال ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ہوتا ہے اس میں خیر اور بھلائی ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے تمام معاملات میں ''تفویض الامر'' کا رویہ اپناتے ہوئے راضی برضائے ربّ رہنا چاہیے کہ: ع ''ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!''

﴿ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۸۲﴾ ''یہ ہے اصل حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔''

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

# دینی کام سے کس کی معذرت قبول ہوتی ہے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ التوبۃ میں ارشاد ہوا:

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۹۱﴾

''ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکتِ جہاد کے لیے راہ نہیں پاتے' اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوصِ دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں۔ ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ بظاہر معذور ہوں اُن کے لیے بھی مجرد ضعیفی و بیماری یا محض ناداری کافی وجہِ معافی نہیں ہے' بلکہ اُن کی مجبوریاں صرف اس صورت میں ان کے لیے وجہ معافی ہوسکتی ہیں جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے سچے وفادار ہوں۔ ورنہ اگر وفاداری موجود نہ ہو تو کوئی شخص صرف اس لیے معاف نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ادائے فرض کے موقع پر بیمار یا نادار تھا۔ خدا صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا ہے کہ ایسے سب لوگ جو بیماری کا طبی صداقت نامہ یا بڑھاپے اور جسمانی نقص کا عذر پیش کر دیں' اس کے ہاں یکساں معذور قرار دے دیے جائیں اور ان پر سے باز پرس ساقط ہو جائے۔ وہ تو ان میں سے ایک ایک شخص کے دل کا جائزہ لے گا' اور اس کے پورے مخفی و بظاہر برتاؤ کو دیکھے گا' اور یہ جانچے گا کہ اس کی معذوری ایک وفادار بندے کی سی معذرت تھی یا ایک غدار اور باغی کی سی۔

ایک شخص ہے کہ جب اُس نے فرض کی پکار سنی تو دل میں لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ بڑے اچھے موقعے پر میں بیمار ہو گیا' ورنہ یہ بلا کسی طرح ٹالے نہ ٹلتی اور خواہ مخواہ مصیبت بھگتنی پڑتی۔ دوسرے شخص نے یہی پکار سنی تو تلملا اٹھا کہ ہائے' کیسے موقع پر اس کم بخت بیماری نے آن دبوچا' جو وقت میدان میں نکل کر خدمت انجام دینے کا تھا وہ کس بری طرح یہاں بستر پر ضائع



ہو رہا ہے۔ ایک نے اپنے لیے تو خدمت سے بچنے کا بہانہ پایا ہی تھا مگر اس کے ساتھ اس نے دوسروں کو بھی اس سے روکنے کی کوشش کی۔ دوسرا اگرچہ خود بسترِ علالت پر مجبور پڑا ہوا تھا مگر وہ برابر اپنے عزیزوں' دوستوں اور بھائیوں کو جہاد کا جوش دلاتا رہا اور اپنے تیمارداروں سے بھی کہتا رہا کہ میرا اللہ مالک ہے' دوا دارو کا انتظام کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گا' مجھ اکیلے انسان کے لیے تم قیمتی وقت کو ضائع نہ کرو جسے دینِ حق کی خدمت میں صرف ہونا چاہیے۔ ایک نے بیماری کے عذر سے گھر بیٹھ کر سارا زمانہ' جنگ بددلی پھیلانے' بری خبریں اڑانے' جنگی مساعی کو خراب کرنے اور مجاہدین کے پیچھے ان کے گھر بگاڑنے میں صرف کیا۔ دوسرے نے یہ دیکھ کر کہ میدان میں جانے کے شرف سے وہ محروم رہ گیا ہے' اپنی حد تک پوری کوشش کی کہ گھر کے محاذ (Home Front) کو مضبوط رکھنے میں جو زیادہ سے زیادہ خدمت اس سے بن آئے اسے انجام دے۔ ظاہر کے اعتبار سے تو یہ دونوں ہی معذور ہیں۔ مگر خدا کی نگاہ میں یہ دو مختلف قسم کے معذور کسی طرح یکساں نہیں ہو سکتے۔ خدا کے ہاں معافی اگر ہے تو صرف دوسرے شخص کے لیے۔ رہا پہلا شخص تو وہ اپنی معذوری کے باوجود غداری و ناوفاداری کا مجرم ہے۔

(انتخاب: انجینئر حافظ نوید احمد)


**ہماری ویب سائٹ**

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو' ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

# اسلام میں شرم وحیا
# اور استقامت کی اہمیت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

۲۸/مارچ ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ  بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (القصص)

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (التوبۃ)

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ عُقْبَةَ بْنِ عَمْرٍو الْاَنْصَارِیِّ الْبَدْرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :

((اِنَّ مِمَّا اَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰى اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ )) (۱)

سیدنا ابومسعود عقبہ بن عمرو انصاری بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’سابقہ نبوت کے کلام میں سے لوگوں نے جو باتیں پائی ہیں‘ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب تم حیا چھوڑ دو تو جو دل چاہے کرو!‘‘

عَنْ اَبِیْ عَمْرٍو ، وَقِیْلَ اَبِیْ عَمْرَةَ سُفْیَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ قَالَ : قُلْتُ : یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قُلْ لِّیْ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب اذا لم تستحی فاصنع ما شئت



فِی الْاِسْلَامِ قَوْلًا ، لَا اَسْاَلُ عَنْهُ اَحَدًا غَیْرَكَ ، قَالَ :

((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) (۱)

سیدنا ابوعمرو (یا ابوعمرہ) سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ میں نے کہا: یارسول اللہ! مجھے اسلام کے بارے میں کوئی ایسی واضح بات فرمائیں کہ اس کے متعلق مجھے آپ کے علاوہ کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

’’تم کہو میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا‘ اور پھر اس پر ثابت قدم رہو!‘‘

معزز سامعین کرام!

امام یحییٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور مجموعہ احادیث ’’اربعین نووی‘‘ کے سلسلہ وار مطالعہ کے ضمن میں آج دو احادیث (حدیث ۲۰ اور ۲۱) ہمارے زیر مطالعہ آئیں گی۔ یہ دونوں احادیث انتہائی مختصر مگر اپنے موضوع کے حوالے سے جامع ترین ہیں۔ پہلی حدیث حضرت ابومسعود عقبہ بن انصاری بدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے‘ جو بدری صحابی ہیں اور ان کا تعلق انصار سے ہے۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں شامل کیا ہے۔

## زیر مطالعہ حدیث اور اس کی تشریح

حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ مِمَّا اَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلٰى)) ’’نبوتِ اولیٰ (یعنی پہلے انبیاء کرام علیہم السلام) کے کلام میں سے جو چیز لوگوں نے پائی ہے یا جو اُن کے پاس محفوظ ہے‘‘ —— ظاہر بات ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا ایک سلسلۃ الذہب ہے اور ہم اللہ کے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ ان کی تعلیمات میں کچھ تحریف بھی ہوئی‘ اور کچھ نسیان کا شکار بھی ہو گئیں کہ لوگوں نے اُن کی تعلیمات کو بھلا دیا۔ بہرحال ان کی تعلیمات کے کچھ نہ کچھ اثرات اُس وقت یعنی دورِ نبویؐ میں بھی موجود تھے اور وہ حکمت کے موتیوں کی طرح سے لوگوں کے اندر مشہور تھے۔ انہی میں سے ایک موتی وہ ہے جس کی نشاندہی حضور ﷺ نے فرمائی:

((اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ ))

’’جب تم حیا کا پردہ اٹھا دو تو پھر جو چاہو کرو!‘‘

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب جامع الاوصاف الاسلام

## خوف اور حیا کا مرکز: انسانی دماغ کا اعلیٰ ترین حصہ

زیر مطالعہ حدیث درحقیقت ایک بہت بڑی نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے — حیا کے بارے میں ایک اور حدیث بہت مشہور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِنَ الْاِیْمَانِ))(۱) ''حیا ایمان کی ایک شاخ' ایک شعبہ ہے''۔ یعنی حیا ایمان کا حصہ ہے۔

میں اس کی مزید وضاحت کر رہا ہوں کہ حیا زندگی کا جزوِ لازم ہے' اس لیے کہ حیات اور حیا کا مادہ ایک ہی (ح ی ی) ہے۔ اصل میں ہمارا مرکزی اعصابی نظام (Central Nervous System) ہمارے دماغ (Brain) اور حرام مغز (Spinal Cord) پر مشتمل ہے جو ریڑھ کی ہڈی میں چل رہا ہے۔ دماغ میں اعلیٰ ترین حصہ سیریبرم (cerebrum) ہے۔ یہ گرے میٹر (gray matter) کہلاتا ہے اور رنگ دار سا پیلا سا مادہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے نیچے ایک سفید حصہ ہوتا ہے۔ دماغ کے اندر جو مختلف ایریاز ہیں' وہ منقسم ہیں۔ دیکھنے (vision) کا ایریا ہماری پشت پر ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ دیکھنا آنکھ سے ہوتا ہے۔ آنکھ دیکھتی ضرور ہے' مگر سمجھ نہیں سکتی' تشریح (interpret) نہیں کر سکتی' اس لیے کہ یہ تو ایک کیمرے کی مانند ہے۔ اس کے لینز کے سامنے جو کچھ آیا اس نے اس کی تصویر اتار دی۔ اب اس تصویر کا سمجھنا' اس کی تشریح کرنا' اس کا تجزیہ کرنا اور پھر اس سے نتیجے نکالنا' یہ آنکھ کا کام نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے انسانی دماغ میں ایک خاص ایریا مختص ہے جو اس گرے میٹر کا پچھلا حصہ ہے۔ وہ تمام چیزیں جو ہماری آنکھ دیکھتی ہے وہاں جا کر' اس کمپیوٹر میں interpret ہوتی ہیں۔

اسی طرح میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ انسانی دماغ کے اندر ''سپیچ سنٹر'' سب سے بڑا اور اہم ایریا ہے۔ انسان حیوانِ ناطق ہے' اسے اللہ نے نطق کی صلاحیت دی ہے۔ انسان اظہار مافی الضمیر بھی کر سکتا ہے اور دوسرے انسان کی بات بھی سمجھ سکتا ہے۔ گویا

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب امور الایمان۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان عدد شعب الایمان.....



نطق وہ چیز ہے جو انسان کو حیوانات سے ممیّز کرتی ہے۔ اس کے بھی انسانی دماغ میں دو علاقے ہیں' ایک بائیں جانب اور دوسرا دائیں جانب۔ ایک کا کام یہ ہے کہ وہ کسی اور کے کلام کو سمجھتا ہے' اس کی تشریح و تجزیہ کرتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ نکالتا ہے' جبکہ دوسرے ایریا کا کام یہ ہے کہ وہ خود انسان کے اپنے مافی الضمیر کو واضح کرتا ہے' بیان کرتا ہے۔ تو یہ دونوں حصے سپیچ سنٹر کے ہیں۔ لیکن سیریبرم کا جو سب سے اعلیٰ (highest) حصہ ہے وہ fear & shyness center ہے یعنی خوف اور حیا کا حصہ۔

## حیا اور حیات کا خصوصی تعلق

اس ضمن میں نوٹ کیجیے کہ حیا کا حیات کے ساتھ خصوصی تعلق ہے' اس لیے کہ حفظِ ذات (preservation of the self) سب سے بڑا محرک (motive) ہے اور یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کے بعد ہے اپنی نسل کو برقرار رکھنا (preservation of the species)۔ اس کے لیے آدمی شادیاں کرتا ہے اور پھر اولاد اور اپنے کنبے کے سو جھمیلوں کو برداشت کرتا' اس کا بوجھ اُٹھاتا ہے۔ یہ سب اس لیے کرتا ہے کہ اپنی نسل کو برقرار رکھنا' اس کو بچانا اس کے فطری اور جبلی داعیات (instincts) میں سے ہے۔ البتہ اپنے آپ کو بچانا یعنی حفظ ذات اہم ترین محرک ہے' اور اس کے یہ دو فنکشنز ہیں: خوف اور حیا (fear & shyness)۔ یعنی خطرہ ہے تو اس سے اپنا بچاؤ کرنا' شیر آ رہا ہے تو بھاگو' دوڑو۔ یہ خوف ہے۔ اسی طرح حیا اور جھجک بھی درحقیقت انسان کے دماغ اور سیریبرم کے اعلیٰ ترین حصے کا جزو ہے۔

## شراب کا اوّلین اثر: حیا اور خوف کا خاتمہ

اس ضمن میں میں ایک اور حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھئے' شراب کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ انسانی دماغ کی تمام سطحوں (levels) کو رفتہ رفتہ ناک آؤٹ کرتی ہے' ایک دم سارے دماغ کو متاثر نہیں کرتی۔ مثلاً آپ نے تھوڑی سی شراب پی لی ہے تو خوف اور جھجک (حیا) دونوں جاتے رہیں گے۔ اس سے انسان میں جرأت و بہادری

(boldness) پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ شراب پی کر ایک مقرر بڑی عمدہ تقریر کرے گا‘ ورنہ مقرر کو احساس یا خدشہ ہوتا ہے کہ میری تقریر کا پتا نہیں لوگ کیا اثر لے رہے ہوں گے‘ دل میں اس کا کوئی مذاق اڑا رہا ہوگا‘ وغیرہ۔ یہ خدشات و احساسات ایک مقرر کو قدم قدم پر روکتے ہیں‘ لیکن جب جھجک ختم ہوگئی تو اب اس کے ذہن سے یہ سارے خدشات ختم ہو جائیں گے اور وہ بہت عمدہ تقریر کرے گا۔ اسی طرح اگر کوئی بہت بڑا وکیل ہے تو شراب پی کر جو وہ مقدمے کی پیروی کرے گا وہ بغیر شراب کے نہیں کر سکتا۔ اسی طور سے لڑائی کا معاملہ ہے۔ لیکن یہ سب اُس وقت ہے جب شراب کی مقدار کم ہو۔ اور اگر شراب کی مقدار زیادہ ہو جائے گی تو پھر وہ نچلی سطحوں کو بھی متاثر کرے گی اور ڈپریشن پیدا کرے گی اور پھر یہ ڈپریشن دماغ کے ساری سطحوں کو نقصان پہنچاتا چلا جائے گا۔ البتہ شراب کا پہلا کام خوف اور حیا کو ختم کرنا ہے۔ اس سے مقرر اچھی تقریر کرے گا اور شاعر اچھے اشعار کہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سارے کے سارے بڑے شاعر‘ غالب ہو یا کوئی اور‘ اس لال پری سے جی بہلاتے تھے۔ اقبال بھی ابتدائی دور میں شراب پیتے تھے۔ جگر نے تو خود کہا ہے: ؎

سب کو مارا جگر کے شعروں نے  اور جگر کو شراب نے مارا

اس لیے کہ شراب تو گویا ان کی گھٹی میں تھی‘ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ جگر موت سے کافی پہلے تائب ہوئے اور توبہ کرنے کے بعد پھر جو شاعری انہوں نے کی ہے وہ بڑی نفیس اور بہت روحانی پہلو لیے ہوئے تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی جو غزلیں مشہور ہیں وہ تو اُسی شراب نوشی کے دور کی ہیں۔ الغرض‘ خوف اور حیا کے ختم ہونے سے مقرر اچھی تقریر کرے گا‘ وکیل اچھے دلائل دے گا اور شاعر اچھی شاعری کرے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ شراب کے زیر اثر انسان بالکل ہی نڈر اور بے حیا ہو جاتا ہے۔

اس اعتبار سے حیا (shyness) بہت اہم شے ہے‘ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ حیا ایمان کا حصہ ہے اور اس کی مزید تشریح میں‘ میں نے بتایا کہ درحقیقت یہ حیات کا جزوِ لازم ہے‘ بایں طور کہ انسان اپنی حیات کو بچانے کے لیے خوف اور حیا کے میکنزم کا استعمال کرتا ہے۔



## عورت میں حیا کا مادہ زیادہ ہے!

یہ خالقِ کائنات کی حکمتِ تخلیق ہے کہ اُس کی طرف سے حیا کا مادہ مرد کی نسبت عورت میں زیادہ رکھا گیا ہے۔ مرد اپنی جسمانی ساخت‘ اپنی صلاحیتوں اور functions جو اسے دیے گئے ہیں‘ ان کی رو سے فعال اور متحرّک (active) ہوتا ہے‘ اقدام کرتا ہے‘ جبکہ عورت گریز کرتی ہے۔ عورت کے نسوانی حسن کا یہ خاصّہ ہے کہ وہ گریز کرے‘ اور اگر عورت میں بھی اقدام آ جائے تو پھر اس کی وہ نسوانیت ختم ہوگئی اور وہ بھی مرد ہوگئی۔ اس لیے کہ عورت کی خلقت میں شرم و حیا اور گریز کا عنصر ہے۔ کوئی بھی معاملہ ہو‘ چاہے وہ عام طور پر جس کو ہم عشق مجازی کہتے ہیں‘ اس میں بھی اقدام مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ مرد طالب ہوتا ہے اور عورت مطلوب ہوتی ہے۔ تو یہ مادہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے اندر زیادہ رکھا ہے اور یہ عورت کے نسوانی حسن کا سب سے بڑا زیور اور سب سے بڑا حصہ ہے۔

سورۃ القصص میں اس کا بڑا خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے — حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے چل کر مدین تک پہنچے ہیں اور اس دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پورا صحرائے سینا عبور کیا ہے۔ کوئی سواری کیا‘ کوئی شے پاس تھی ہی نہیں‘ اور یہ سانپوں سے بھرا ہوا صحرا تھا۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے محل میں کروائی تھی۔ وہ اس طرح کہ فرعون بے اولاد تھا‘ اور جب دریائے نیل میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ صندوقچہ برآمد ہوا جس میں ان کی والدہ نے اللہ کے حکم کے تحت انہیں ڈال کر اسے نیل کے اندر بہا دیا تھا تو فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے لگا تھا۔ اس لیے کہ وہ پہچان گیا تھا کہ یہ اسرائیلی ہے اور وہاں پر ہر اسرائیلی بچے کو مار دینے کا قانون رائج تھا۔ اس پر اُس کی بیوی آڑے آ گئی۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسی موہنی صورت دی تھی کہ جو دیکھتا تھا وہ آپ پر فریفتہ ہو جاتا تھا۔ اس بارے میں سورۂ طٰہٰ میں بڑے پیارے الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ﴾ (آیت ۳۹) ’’(اے موسیٰؑ) ہم نے آپ کے اوپر اپنی محبت کا ایک پرتو ڈال دیا تھا‘‘۔ لہٰذا آپ کی موہنی صورت دیکھ کر اس کی اہلیہ حضرت آسیہ سلامٌ علیہا جو بنی اسرائیل میں سے تھیں‘ حضرت

موسیٰ علیہ السلام پر دل و جان سے فریفتہ ہوگئیں اور فرعون کو ان کے قتل کے ارادے سے باز رکھا — اللہ تعالیٰ نے سورۃ التحریم میں اہل ایمان عورتوں کے لیے حضرت آسیہ کی مثال دی ہے۔فرمایا:

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۱﴾

''اور مؤمنوں کے لیے (ایک) مثال (تو) فرعون کی بیوی کی بیان فرمائی کہ اس نے اللہ سے التجا کی کہ اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال (زشت مآل) سے نجات بخش اور ظالم لوگوں کے ہاتھ سے مجھ کو مخلصی عطا فرما۔''

چنانچہ حضرت آسیہ نے کہا: ﴿قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۭ لَا تَقْتُلُوْهُ ۡ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ (القصص:۹) ''یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا' اس کو قتل نہ کرنا' شاید یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں''۔فرعون اور آسیہ کے مابین بڑی موافقت اور اُلفت تھی' چنانچہ فرعون نے ان کی بات مان کر یہ بچہ انہیں گود لینے کی اجازت دے دی۔اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں محل میں پلے' بڑھے۔اس کے بعد فرعون کے ہاں بھی ایک لڑکا پیدا ہوگیا' اس طرح اب یہ گویا دو بھائی ہوگئے اور دونوں نے بھائیوں کی طرح پرورش پائی۔جب فرعون بڑھاپے کو پہنچا تو اُس نے تخت چھوڑ دیا اور اپنے سگے بیٹے کو اس کا وارث بنادیا۔اس حوالے سے قرآن مجید اور تورات کا بیان ذرا مختلف ہے۔

قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک مخبر نے یہ خبر دی کہ اے موسیٰ! بادشاہ کے دربار میں تمہارے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں' لہٰذا یہاں سے نکل بھاگو!

﴿قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۰﴾ (القصص) ''اُس نے کہا: اے موسیٰ! (شہر کے) سردار تمہارے بارے میں صلاح مشورہ



کر رہے ہیں کہ تمہیں مار ڈالیں' سو تم یہاں سے نکل جاؤ' میں تمہارا خیر خواہ ہوں''۔ اس مخبری پر حضرت موسیٰ علیہ السلام فوراً ہی مصر کو چھوڑ کر صحرائے سینا کی طرف چلے گئے اور پورا صحرائے سینا عبور کیا۔اس ضمن میں تورات کا بیان ذرا مختلف ہے۔یورپ میں ''Ten Commandments'' کے نام سے جو فلم بنی ہے وہ تورات کے بیان پر ہے' اس لیے کہ وہ تو تورات ہی کو مانتے ہیں۔اس میں یہ ہے کہ اسی چھوٹے بھائی (فرعون) نے اپنی رتھ (chariot) پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سوار کرایا اور صحرا کے کنارے لاکر چھوڑ دیا' پھر بڑی نفرت کے ساتھ کہا: جاؤ' اب نبوت انسانوں پر نہیں صحرا کے اندر موجود سانپوں پر کرو!

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام سارے صحرا کو عبور کر کے تھکے ماندے' بھوکے پیاسے مدین پہنچے اور وہاں ایک پانی کے کنویں کے پاس جا کر پڑاؤ ڈالا۔وہاں انہوں نے دیکھا کہ دو لڑکیاں کنویں کے ایک طرف کھڑی ہیں اور اپنے ریوڑ کو پانی پینے سے روک رہی ہیں۔بکریاں پانی کی طرف دوڑتی ہیں اور وہ انہیں روکتی ہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ تم اپنے ریوڑ کو پانی کیوں نہیں پلاتیں؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے والد بوڑھے ہیں اور یہ چرواہے بڑے سخت دل ہیں۔لہٰذا جب تک یہ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر نہ چلے جائیں ہم اپنے ریوڑ کو پانی نہیں پلا سکتیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام جلالی مزاج کے آدمی تھے' لہٰذا وہ کنویں کے پاس گئے اور چرواہوں اور ان کے جانوروں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر ان لڑکیوں کے ریوڑ کو پانی پلایا اور وہ اپنا ریوڑ لے کر چلی گئیں۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور انہوں نے اس وقت یہ دعا مانگی: ﴿رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ۝۲۴﴾ ''اے میرے پروردگار! میں تو تیری ہر اُس خیر اور خیرات کا مستحق ہوں جو تُو میری جھولی میں ڈال دے''۔یہ فقر کی انتہا ہوتی ہے۔ایک فقیر کہتا ہے کہ میں نے ایک روپیہ نہیں لینا' پانچ روپے لینے ہیں۔یعنی وہ نخرہ کرتا ہے' جبکہ اس کے مقابلے میں ایک فقیر وہ ہے جو کہتا ہے کہ ایک دھیلا بھی اگر آپ میری جھولی میں ڈال دو تو میں اس کا بھی مستحق ہوں' اس لیے

کہ میرے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے رب! تو جو بھی خیر میری جھولی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں‘ اس لیے کہ اس اجنبی جگہ پر میرا کوئی جاننے پہچاننے والا نہیں ہے‘ میرے پاس کوئی ذریعہ کوئی وسیلہ نہیں اور میں ہر شے کا فقیر ہوں۔

دوسری طرف اُن لڑکیوں نے گھر جا کر اپنے والد کو سارا واقعہ بتایا۔ اب ان میں سے ایک لڑکی اپنے والد کا پیغام لے کر جب آئی تو اس کی چال ڈھال کے لیے قرآن میں جو الفاظ آئے ہیں‘ ان کے لیے میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سارا واقعہ آپ کو سنایا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے لیے الفاظ آئے ہیں: ﴿فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ﴾ ’’پس آئی ان دونوں میں سے ایک لڑکی حیا کے ساتھ چلتی ہوئی‘‘۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عورت کے چلنے میں بھی حیا ہے۔

## مغرب عورت کی حیا کو ختم کرنے پر تُلا ہوا ہے!

اللہ تعالیٰ نے عورت کی فطرت میں جو بھی عناصر رکھے ہیں‘ ان میں مرد کے مقابلے میں حیا کا پہلو بہت قوی ہے‘ جس کو مغرب آج ختم کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ مغرب حیا کے پردے کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اس وقت دنیا میں اس کے لیے جو عظیم تحریک چل رہی ہے‘ اس کو ’’سوشل انجینئرنگ پروگرام‘‘ کا دل فریب نام دیا گیا ہے۔ یعنی سوسائٹی اور معاشرہ کی تعمیرِ نو کرنی ہے‘ اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ عورت میں سے حیا کو باہر نکال دو۔ مغرب میں عورت کی بے پردگی کا معاملہ کوئی بہت پرانا نہیں ہے‘ بلکہ زیادہ سے زیادہ سَو‘ سوا سو سال پرانا ہے۔ امریکہ کی پرانی فلموں میں عورت مکمل لباس زیبِ تن کیے ہوتی تھی‘ یعنی گردن سے لے کر ٹخنے تک‘ سوائے چہرے کی ٹکیا کے اور سر پر ان کے یقیناً سکارف ہوتا تھا۔ یہ جو سکرٹس اور منی سکرٹس آنی شروع ہوئی ہیں ان کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔

۱۸۹۷ء میں ’’پروٹوکولز آف دی ایلڈرز آف زائن‘‘ کی پہلی کانفرنس سوئٹزرلینڈ کے شہر Basel میں ہوئی تھی‘ جہاں ٹاپ کے یہودی جمع ہوئے تھے اور ان میں سے بیشتر یہودی بینکرز تھے۔ Zionist موومنٹ بھی یہودی بینکرز کی تحریک ہے اور وہ مذہبی



یہودی نہیں ہیں‘ بلکہ سیکولر ٹائپ کے یہودی ہیں۔ مذہبی یہودی وہ ہیں جو کبھی آپ نے کسی فلم یا اخبارات میں دیکھے ہوں گے یا آپ امریکہ گئے ہوں تو آپ نے وہاں دیکھا ہوگا کہ بروک لین کا علاقہ ان سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی چھلے دار زلفیں ہوتی ہیں۔ عام طور پر جہاں سے خط بنایا جاتا ہے وہاں سے وہ اپنے بالوں کو پھیلاتے ہیں اور بہت خوبصورت انداز میں چھلے دونوں طرف لٹکا لیتے ہیں۔ ان کی داڑھیاں لمبی ہوتی ہیں۔ سر ننگے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سر کے اوپر چھوٹی سی ٹوپی نہیں بلکہ پورا ہیٹ ہوتا ہے اور وہ بھی سیاہ رنگ کا۔ اسی طرح انہوں نے سیاہ اَچکن کی طرز کا لمبا کوٹ پہنا ہوتا ہے۔ یہ ہیں مذہبی یہودی۔ لیکن سوئٹزرلینڈ کے شہر Basel میں جو لوگ جمع ہوئے تھے وہ سب سیکولر تھے اور بینکرز کے نمائندے تھے۔ نوعِ انسانی کے لیے انہوں نے جو چیزیں طے کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شرم و حیا کا جنازہ نکال دیا جائے تاکہ انسان حیوان بن جائے اور پھر ہم ان حیوانوں کو استعمال کر سکیں۔ یہ ان کا فلسفہ ہے کہ سوائے یہودیوں کے تمام بنی آدم انسان نما حیوان ہیں‘ یعنی شکل تو انسانوں کی سی ہے لیکن درحقیقت سب حیوان ہیں۔ چنانچہ غیر یہودی انسانوں کے لیے وہ goy`ims اور gentiles کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جیسے حیوان کو استعمال کرنا عام انسان کا حق ہے —— گھوڑے کو تانگے میں اور بیل کو ہل میں جوتا جاتا ہے —— اسی طرح ہمارا حق ہے کہ ہم انسان نما حیوانوں کو بھی اسی طرح استعمال کریں۔ اور یہ بات ان کی باقاعدہ مذہبی تعلیمات میں شامل ہے۔

یہودیوں کی مذہبی کتاب ’’تالمود‘‘ جو اصل میں فقہ کی کتاب ہے اور مذہبی اعتبار سے بہت اہم ہے‘ اس میں یہ مذکور ہے کہ غیر یہودیوں کو دھوکہ دینا‘ ان سے سود وصول کرنا‘ ان کے مال پر ڈاکہ ڈالنا‘ چوری کرنا وغیرہ جائز ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس کا تذکرہ بایں الفاظ موجود ہے: ﴿قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ (آل عمران:۷۵) ’’وہ کہتے ہیں کہ ان اُمیوں کے ساتھ ہم جو چاہیں کریں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے‘‘۔ چنانچہ آزادیٔ نسواں (Women Lib) کے نام پر شرم و حیا کو ختم کرنے کی ایک عظیم تحریک

اس وقت سے چل رہی ہے۔لیکن ہم پاکستانیوں کے لیے انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ پرویز مشرف کی حکومت نے ساری دنیا سے آگے بڑھ کر اس تحریک کو لبیک کہا۔اس لیے کہ تمام اداروں‘ یعنی سینٹ میں‘ پارلیمنٹ میں اور اس سے نیچے یونین کونسلوں میں ۳۳ فیصد عورتوں کی نمائندگی مقرر کر دینا‘ عورتوں کو گھر سے نکالنے کا اتنا بڑا کام پاکستان کے علاوہ پوری دنیا میں کہیں نہیں ہوا۔ آج تک امریکہ اور یورپ میں بھی ایسا نہیں ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں جمہوریت کا وجود ایک معجزہ ہے۔ معجزہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دنیا میں یہ مانا جاتا ہے کہ کم شرح خواندگی میں ڈیموکریسی نہیں چل سکتی۔ لوگوں کے اندر خواندگی ہونی چاہیے‘ تعلیم ہونی چاہیے‘ تب ڈیموکریسی چل سکتی ہے۔ جبکہ بھارت انتہائی کم شرح خواندگی کے ساتھ اس بہترین انداز سے جمہوریت چلا رہا ہے کہ دنیا دیکھ کر حیران ہو رہی ہے‘ لیکن ان کے ہاں بھی عورتوں کی نمائندگی کی شرح ۳۳ فیصد نہیں ہے‘ صرف چند عورتیں ہیں جو پارلیمنٹ میں آجاتی ہیں۔ امریکہ کے اندر بھی گنی چنی عورتیں جنرل الیکشن جیت کر آجاتی تھیں‘ جیسے ہمارے ہاں جنرل الیکشن جیت کر بے نظیر آجاتی تھی اور اس طرح سے چند ایک اور عورتیں بھی آجاتی تھیں۔ یہ کبھی نہیں تھا کہ ۳۳ فیصد سیٹیں عورتوں کے لیے مختص کی جائیں اور خواتین سے ہی اُن کو پُر کرنے کو لازم قرار دے دیا جائے۔

اس وقت بے حیائی کی اشاعت یو این او کے ایجنڈے پر ہے۔ چنانچہ اس کے لیے پہلی کانفرنس قاہرہ میں ہوئی تھی۔ پانچ سال کے بعد بیجنگ کانفرنس اور پھر بیجنگ پلس فائیو کانفرنس ہوئی۔ یہ تمام کانفرنسیں اقوامِ متحدہ کے تحت ہوئی ہیں اور وہاں طے ہوا ہے کہ شرم و حیا جو عورت کا سب سے بڑا زیور ہے‘ اسے ختم کیا جائے۔ اس وقت مغرب کا معاشرہ اور مغرب کی ساری طاقت اسی پر لگی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں تو شرم و حیا ختم ہو چکی ہے اور بے حیائی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا سے بھی حیا کا خاتمہ ہو جائے۔ جیسے اگر کسی بلی کی دم کٹ جائے تو وہ یہی چاہے گی کہ سب بلیوں کی دُمیں کٹ جائیں‘ ورنہ وہ تو تمام بلیوں کے اندر ’’نکو‘‘ بنی رہے گی۔ اسی طرح مغربی



ممالک بھی پوری نوعِ انسانی سے حیا کے زیور کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اصل میں یہ ایجنڈا یہودیوں کا ہے جس کے آلہ کار عیسائی بن رہے ہیں اور عیسائیوں میں سے بھی خاص طور پر White Anglo Saxon Protestants (WASP) فرقہ اس میں پیش پیش ہے۔ پھر اس فرقے کی بھی اعلیٰ سطح کی کلاس Evengelists (جن کو ’’نیو کانز‘‘ بھی کہا جاتا ہے) اسرائیل کے سب سے بڑے سپورٹر ہیں اور ان کے پروگرام کی تکمیل میں یہ سب سے بڑے آلہ کار ہیں۔ واضح رہے کہ wasp ’’بھڑ‘‘ کو کہتے ہیں جس کے کاٹنے سے جسم سوج جاتا ہے۔

## بچوں پر روک ٹوک لگانا از حد ضروری ہے

آج کل مغرب کے اثر کے تحت یہ سوچ عام ہو گئی ہے کہ بچوں پر کوئی روک ٹوک نہ لگاؤ‘ اس لیے کہ یہ بات ان کی نشوونما (development) میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یہ سوچ سراسر حماقت ہے اور یہ حضور اکرم ﷺ کی تعلیم کے برعکس ہے۔ ہمیں تو یہ تعلیم ملی ہے کہ اپنی چھڑی کو کبھی اٹھا کر نہ رکھ دینا‘ بلکہ اولاد کو سیدھا رکھنے کے لیے اس کو استعمال کرنا ہے۔ اولاد کو محبت بھی بھرپور دو‘ لیکن ساتھ ہی ان پر کڑی نظر رکھو۔ جیسے ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ ’’کھلاؤ تو چُوری چُور کے اور دیکھو گھور کے‘‘۔ بچوں کے اوپر جب تک بڑوں کا رعب نہ ہو‘ بڑوں کا خوف نہ ہو‘ بڑوں کی حیا نہ ہو کہ میرے اس کام پر والد کیا کہہ دیں گے تو ہمارے نزدیک ان کی صحیح انسانی نشوونما (human development) نہیں ہوتی۔ وہ بچے جنہیں آپ جری‘ بے شرم‘ بے حیا اور بے ادب بنا دیتے ہیں وہ پھر آپ کے سینے پر مونگ دلتے ہیں‘ آپ کے بڑھاپے کے اندر سوہانِ روح بنتے ہیں۔ ان کے اندر کہاں سے وہ آداب آجائیں گے اور کہاں سے وہ تہذیب آجائے گی جو بچپن میں اگر انہیں نہ سکھائی گئی ہو؟ اسی طرح نماز کے بارے میں حکم ہے کہ بچے کو سات سال کی عمر سے نماز کی تلقین شروع کر دو اور دس برس کے بعد بھی اگر بچہ نماز نہیں پڑھتا تو اس کو مارو۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ملاحظہ ہو:

((مُرُوْا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ

اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ)) (۱)

''اپنی اولاد کو نماز پڑھنے کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہو جائیں' اور جب دس برس کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر ان کو مارو۔ اور ان کے بستر بھی الگ کر دو۔''

لہٰذا جدید چلڈرن سائیکالوجی کی بڑی حماقتوں میں سے ایک حماقت یہ ہے کہ بچوں کو روک ٹوک کرنے سے ان کے اندر جو آزاد شخصیت کے پروان چڑھنے کا امکان ہوتا ہے' وہ ان میں کم ہو جاتی ہے تو انہیں روکو ٹوکو نہیں' وہ جو چاہے کریں۔ ایسی سوچ سراسر حماقت اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

بہر حال زیر مطالعہ حدیث انتہائی اہمیت کے حامل ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کے اندر یہ بات موجود تھی کہ جب تم نے حیا کا پردہ اٹھا دیا تو جو چاہو کرو۔ اس لیے کہ یہی تو بیریئر تھا' یہی تو روک ٹوک کی بات تھی۔ فارسی میں اس کا بہترین ترجمہ ہے: ''بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن!'' یعنی ایک دفعہ ذرا حیا کا پردہ اٹھا دو تو جو چاہو کرتے پھرو!

# استقامت اور اس کے ثمرات

اب ہم اگلی حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سیدنا ابوعمرو (یا ابوعمرہ) سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' میں نے کہا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قُلْ لِّيْ فِي الْاِسْلَامِ قَوْلًا ' لَا اَسْاَلُ عَنْهُ اَحَدًا غَيْرَكَ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے اسلام کے بارے میں ایک بات ایسی بتا دیجیے کہ پھر مجھے کسی سے کچھ اور پوچھنے کی ضرورت ہی نہ رہے''۔ اس کا یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے ایسی بات بتا دیجیے کہ اس کے بعد میں کسی سے کچھ اور نہ پوچھوں۔ لیکن میں ان الفاظ کی ترجمانی اس طرح کر رہا ہوں کہ مجھے ایسی جامع بات بتا دیجیے کہ پھر مجھے کسی اور سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) ''کہو میں ایمان لایا اللہ پر اور پھر جم جاؤ''۔ یعنی

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب الصلاۃ' باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ۔



پھر اپنے اس قول پر جمے رہو' ثابت قدم رہو! یہ جم جانا' ڈٹ جانا اور استقامت' اس ایک لفظ کے اندر ایک قیامت مضمر ہے۔

## استقامت کے پہلا داخلی ثمر: محبتِ الٰہی

ایمان اور اس پر استقامت کے کچھ ثمرات ہیں' ان ثمرات میں سے کچھ داخلی ہیں اور کچھ خارجی۔ ایمان ایک حقیقت ہے جو باطن اور قلب میں ہوتی ہے۔ اس کا ظہور ایسے ہوتا ہے جیسے ایک پودے میں پھول لگتے ہیں۔ ایمان ایسا پودا ہے جس کے کچھ پھول تو ظاہر میں ہوتے ہیں' یعنی خارج میں انسان کی شخصیت کے اندر' اور اس کے کچھ پھول وہ ہیں جو انسان کی شخصیت کے اندر لہلہاتے ہیں۔ یہ اندر کے پھول کون سے ہیں؟ ان میں سے اولین اللہ تعالیٰ کی محبت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہر شے سے بڑھ کر محبوب نہیں ہو گیا تو پھر ایمان پر استقامت نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵) ''اور جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں''۔ اسی محبتِ خداوندی کے تابع اللہ کے رسول ﷺ کی محبت اور جہاد فی سبیل اللہ کی محبت ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں یہ ترتیب آئی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۴﴾

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے' اگر تمہیں اپنے باپ' اپنے بیٹے' اپنے بھائی' اپنی بیویاں (یا عورتوں کے لیے شوہر)' اور تمہارے اپنے عزیز و رشتہ دار' اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے جمع کیے ہیں' اور وہ کاروبار (جنہیں بڑی مشکل سے تم نے جمایا ہے اور) جن کے کساد کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے' اور وہ کوٹھیاں (جو تم نے بڑے شوق سے تعمیر کی ہیں اور) وہ تمہیں بڑی محبوب ہیں' اگر یہ چیزیں تمہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے' اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد سے تو

انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں‘ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘

الغرض ایمان کا صرف زبانی دعویٰ کافی نہیں ہے‘ بلکہ لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ ، لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ ، لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ ، لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ کی کیفیت اگر حقیقی معنوں میں نہیں ہے تو پھر ایمان بھی نہیں ہے!

## استقامت کا دوسرا داخلی ثمر: رضا برضائے رب

استقامت کے داخلی ثمرات میں سے ایک اہم ثمر راضی برضائے رب رہنا ہے۔ یعنی جو رب کی طرف سے آ رہا ہے اس پر کوئی شکوہ زبان پر نہ آئے۔ ایک تو ہے اضطراری حرکت (reflex action) ‘جیسے کسی چیونٹی نے کاٹا ہے تو آپ کا ہاتھ یک دم ہل گیا۔ یہ بے اختیاری عمل ہے اور اس میں آپ کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم‘ جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے ننھے سے بچے تھے‘ دم توڑ رہے تھے تو حضور ﷺ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ کے آنکھوں میں آنسو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تو وہ رحمت ہے جو اللہ نے دلوں میں رکھی ہے۔ باقی ہم کہتے وہی ہیں جو اللہ کو پسند ہے اور ہم اللہ کی رضا پر مکمل راضی ہیں۔ لہٰذا ریفلکس ایکشن کے درجے میں کوئی ری ایکشن ہو جائے‘ کوئی آنسو آ جائیں‘ کوئی اور بات ہو جائے تو یہ الگ بات ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ سے کوئی مستقل شکایت پیدا ہو جائے تو اس سے ایمان کی نفی ہو جائے گی۔ اس حدیث کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ جو ہوتا ہے اللہ کے اذن سے ہوتا ہے اور اس کائنات کے اندر پتا نہیں ہل سکتا جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾ (التوبۃ)

’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ ہرگز کوئی مصیبت نہیں آ سکتی ہے سوائے اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے‘ وہ ہمارا آقا ہے‘ اور ایمان والوں کو تو اللہ



ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔‘‘

یعنی اے منافقو! تم ہمیں رومیوں کی فوج سے اور وہاں کی سخت گرمی سے ڈرا رہے ہو‘ حالانکہ ہمارا تو اس بات پر پورا یقین ہے کہ ہم پر کوئی مصیبت نہیں آ سکتی سوائے اس کے جو ہمارے رب نے ہمارے لیے لکھ دی ہو‘ اور اس کی طرف سے جو بھی آئے وہ ہمیں قبول ہے ع ’’سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!‘‘

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تُو خنجر آزمائی!

اس کو اکبر الٰہ آبادی نے بہت خوبصورت انداز میں کہا ہے:

رضائے حق پہ راضی رہ‘ یہ حرفِ آرزو کیسا
خدا خالق‘ خدا مالک‘ خدا کا حکم‘ تُو کیسا!

یعنی خدا کے خالق اور مالک ہونے کا یقین انسان کو ان وسوسوں سے نجات دلاتا ہے کہ یہ کیوں ہو گیا‘ یہ کیسے ہو گیا‘ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا‘ اس نے میرا کام بگاڑ دیا۔ یہ ساری چیزیں ختم ہو جاتی ہیں صرف اس یقین سے کہ جو آیا اللہ کے حکم سے آیا‘ اور جو درمیان میں ذریعہ بن گیا اُس نے اپنے لیے جو کمائی کرنی تھی‘ کر لی۔ میں نے آپ کو ایک درویش کا قصہ سنایا تھا جو یہ کہتے ہوئے جا رہا تھا ’’جو رب کرے سو ہو‘ جو رب کرے سو ہو!‘‘ ایک شخص نے اٹھا کر اسے پتھر دے مارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو جس نے پتھر مارا تھا وہ کہنے لگا: مجھے کیا دیکھتے ہو‘ جو رب کرے سو ہو! وہ کہنے لگے کہ مجھے پتھر تو اللہ کے اذن ہی سے لگا ہے‘ لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ بیچ میں منہ کس کا کالا ہوا ہے! ظاہر بات ہے کہ تم لاکھ مجھے پتھر مارنا چاہتے‘ اگر اللہ نہ چاہتا تو تم نہ مار پاتے۔ تمہارا نشانہ خطا ہو جاتا‘ تمہارا ہاتھ شل ہو جاتا۔ اقبال اس حوالے سے کہتا ہے:

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا

یعنی مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ایک ذریعے سے اس ہست و بود کے سارے چکروں

سے نکال لیا ہے اور مجھے تسلیم و رضا کا مقام حاصل ہو گیا ہے' بایں طور کہ اب جو بھی میرے رب کی طرف سے آئے' اس پر سرِ تسلیم خم ہے۔

## استقامت کا تیسرا داخلی ثمر: توکّل علی اللہ

استقامت کا تیسرا داخلی پہلو ہے اللہ پر توکل کرنا۔ محنت کرو' بھاگو' دوڑو' کماؤ' جو بھی کرنا ہے کرو' مگر کبھی اپنی صلاحیت اور مادی وسائل پر توکل نہ کرنا۔ یہ تورات کی تعلیم کا بھی مرکزی نکتہ تھا' جو سورۂ بنی اسرائیل کی دوسری آیت میں بیان ہوا ہے کہ میرے سوا کسی پر توکل نہ کرنا۔ چاہے سارے اسباب و وسائل آپ کو مہیا ہوں' لیکن کبھی یہ نہ کہنا کہ یہ کام میں کل ضرور کر دوں گا۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے: There is many a slip between the cup and the lip چاہے ہاتھ میں پیالہ ہے اور پیالے اور آپ کے ہونٹوں کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے' لیکن اگر اللہ کا اذن نہ ہو تو آپ وہ پیالہ منہ کو نہیں لگا سکتے۔ چنانچہ اللہ پر توکل ضروری ہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ محنت نہ کرو۔ محنت بھرپور کرو! محنت نہیں کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم خود اللہ کی مشیت کو توڑ رہے ہو۔ لہٰذا محنت ضرور کرو' مگر یہ یقین بھی ہو کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔

سورۂ بنی اسرائیل کی دوسری آیت کے الفاظ ہیں: ﴿وَاٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَجَعَلۡنٰہُ ہُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾ ''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی تھی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے رہنما مقرر کیا تھا''—— یہاں یہ نکتہ نوٹ کیجیے کہ تورات ''ہُدًی لِّلنَّاسِ'' نہیں ہے۔ ''ہُدًی لِلنَّاسِ'' صرف قرآن ہے' جبکہ تورات ''ہُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ'' ہے۔ سورۃ السجدۃ میں بھی تورات کے لیے ''ہُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ'' آیا ہے—— آگے فرمایا: ﴿اَلَّا تَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِیۡ وَکِیۡلًا ۝۲﴾ ''(اس تاکید کے ساتھ) کہ میرے سوا کسی کو اپنا کارساز مت سمجھنا''۔ یعنی میرے علاوہ نہ کسی ذات پر بھروسا کرنا اور نہ مادی اسباب پر توکل کرنا۔ مثلاً اگر آپ نے کل صبح کہیں جانا ہے اور آپ نے گاڑی کو ہر طرح سے چیک کر لیا ہے' گاڑی کی ٹیوننگ بھی کرا لی ہے' سروس بھی کرا لی ہے' آئل بھی چینج کر لیا ہے' پٹرول یا ڈیزل سے ٹینکی بھی بھری ہوئی ہے' سب کچھ



ہے' کوئی رکاوٹ نہیں ہے' لیکن آپ اگر ان مادی وسائل پر بھروسا کرتے ہوئے یہ کہیں کہ کل صبح میں اُٹھوں گا اور چل دوں گا تو یہ توکّل علی اللہ کے منافی ہے۔

## استقامت کے خارجی ثمرات

استقامت علی الایمان باللہ یعنی اللہ پر ایمان اور اس پر استقامت کے تین تقاضے ہیں' یا یوں کہیے کہ تین داخلی کیفیات و ثمرات ہیں: محبتِ الٰہی' تسلیم و رضا' اور صبر و توکّل۔ یہ تین چیزیں وہ ہیں جو وجود کے اندر ہیں' جبکہ اس استقامت کے کچھ خارجی ثمرات بھی ہیں' اور ان میں سب سے پہلا یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اور اللہ کی مکمل عبادت۔ یعنی تمہارے وجود سے جو عمل بھی خارج ہو وہ اطاعتِ خداوندی اور اطاعتِ رسول ﷺ کے سانچے میں ڈھل کر آئے۔ فانی کا ایک شعر ہے' جو شعر ہونے کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے: ؎

فانی تمہارے عمل سراسر جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں!

یہ ان لوگوں کا قول ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسان مجبورِ محض ہے اور اس کی کوئی آزادی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اسلاف میں ایک طبقہ ایسا رہا ہے جن کو ''جبریہ'' کہا جاتا ہے اور فانی بھی ان میں سے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو یہ سب اللہ کے جبر کے تحت ہے' لیکن ان کو اختیار کے سانچے میں بایں طور ڈھال دیا گیا ہے کہ تم محسوس کرتے ہو کہ یہ میں کر رہا ہوں۔ بہرحال ہمارے وجود سے جو بھی صادر ہو' چاہے ہاتھ سے ہو' پاؤں سے ہو' ناک سے ہو' کان سے ہو' وہ اطاعتِ خدا اور اطاعتِ رسول ﷺ کے سانچے میں ڈھل کر آئے۔

استقامت کی دوسری خارجی کیفیت ہے جہاد و انفاق فی سبیل اللہ۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ استقامت کے دعوے اور دوسری طرف اللہ کے باغیوں سے دوستی یا اللہ کے غداروں کی غلامی پر راضی ہو جانا' یہ کہاں کا ایمان ہے؟ یہ تو ایمان کے منافی ہے۔ مؤمن اگر ایسے باطل سے باغی نہیں ہے تو پھر وہ مؤمن کہاں ہوا؟ سورۃ البقرۃ میں جو آیا ہے: ﴿فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَیُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی

﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) ''جو شخص طاغوت کا کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے اُس نے ایسا مضبوط حلقہ تھام لیا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں''۔ دیکھئے طاغوت کا کفر پہلے ہے اور ایمان باللہ بعد میں ہے۔ اور اگر طاغوت جو اللہ کے سرکش ہیں' ان سے وفاداری اور دوستیاں ہیں تو پھر ایمان نہیں ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے:

((اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ اِهْتَزَّ لِذٰلِكَ الْعَرْشُ وَغَضِبَ لَهُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى))(۱)

''جب کسی فاسق اور فاجر شخص کی مدح کی جاتی ہے تو عرشِ الٰہی کانپنے لگتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر بہت غضب ناک ہوتے ہیں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا بندہ ہونے کا مدعی ہو کر ایک فاسق وفاجر کی تعریف کر رہا ہے' اس کی شان میں لمبا چوڑا سپاس نامہ پیش کر رہا ہے' تو اس پر اللہ عزوجل کو اتنا غصہ آتا ہے کہ عرش لرز اٹھتا ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ وَقَّرَ فَاسِقًا فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ)) (۲)

''جس نے کسی فاسق کی توقیر کی تو اس نے اسلام کی جڑیں کھودنے میں مدد کی۔''

ہمارا جو مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ہے اس میں سورۃ التغابن اور سورۂ حٰمٓ السجدۃ کے دروس میں استقامت اور اس کے داخلی وخارجی ثمرات تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ زیر مطالعہ حدیث کے ضمن میں اِن دروس کا مطالعہ ان شاء اللہ بہت مفید رہے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ذات اور اپنی صفات پر یقین والا ایمانِ حقیقی عطا فرمائے اور اس کے جملہ داخلی اور خارجی تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات

(حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات)

---

(۱) رواہ ابن حبان ' راوی : انس بن مالک ؓ

(۲) طبقات الشافعیة لابن السبکی:۳۱۳/۶۔ تخریج الاحیاء للعراقی:۱۱۱/۲۔

# دُعا کی حقیقت اور اہمیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ اپنی ہر ضرورت کے لیے اس کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جائے' کیونکہ ہر ضرورت وہی پوری کرنے والا ہے۔ وہی دعاؤں کو قبول کرنے والا اور بندوں کی حاجات کو برلانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوق کے کسی فرد سے دعا کرنا شرک کے زمرے میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے کہ وہ بندوں کی دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات میں لاشریک ہے اسی طرح بندوں کی دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے میں وہ یکا اور تنہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے خزانے بے انتہا ہیں اور ان کی وسعت انسانی عقل وفکر میں نہیں آ سکتی۔ اگر وہ دنیا کے ہر جن اور انسان کو اتنا کچھ دے دے جتنا وہ مانگے تو بھی اس کے خزانے میں ایک ذرہ بھر بھی کمی نہیں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور پسند کرتا ہے کہ لوگ اس سے مانگیں۔ دنیا کا معاملہ ہمارے سامنے ہے کہ بڑے سے بڑا سخی بھی مانگنے والوں کو اپنے خزانے سے ایک حد تک دے سکتا ہے اور اکثر مانگنے والوں کو انکار بھی کر دیتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ جو بے حساب خزانوں کا مالک ہے وہ پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے صبح وشام اس سے مانگیں' بلکہ نہ مانگنے والوں سے ناراض ہوتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ﴾ (آیت ۷۷) ''آپ فرما دیجیے اگر تم دعا نہ کرو تو میرا رب بھی تمہاری کچھ پروا نہیں کرے گا۔''

اپنی ضروریات اور حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے دست سوال دراز کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ وہ انسانوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ اس سے مانگیں۔ نیز اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ سے ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرۃ:۱۸۶) ''جب آپؐ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت



کریں (کہ میں دور ہوں یا نزدیک ہوں) تو آپؐ بتا دیجیے کہ میں قریب ہی ہوں۔ دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھ سے دعا مانگے۔''

انسان عبد ہے اور اللہ تعالیٰ معبود۔ دونوں کے درمیان رشتہ عبادت ہے۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال کرتا ہے تو گویا وہ اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس رشتے اور تعلق کا اظہار کرتا ہے۔ چونکہ یہ تعلق ایسی سچائی ہے کہ اس میں کسی طرح کا شک نہیں' لہٰذا پروردگار اس بندے سے خوش ہوتا ہے جو اس صداقت کا اظہار کرتا ہے اور اس کے سامنے عبد اور سوالی بن کر پیش ہوتا ہے۔ گویا اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی داد و دہش کا اقرار کر رہا ہوتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو جتنا بے بس پیش کرتا ہے اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہوتا ہے کہ اس عمل میں سچائی کے علاوہ کچھ نہیں۔ انسان نماز میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے اور اس کی تعریف کرتا ہے۔ پھر رکوع میں جاتا ہے تو اُس کی عظمت بیان کرتا ہے۔ سجدے میں پیشانی زمین پر رکھ کر اس کی بڑائی بیان کرتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے سامنے نیچے سے نیچا ہوتا جاتا ہے اور بندے کا یہ انداز اللہ تعالیٰ کو پسند ہے' کیونکہ وہ ایک اٹل حقیقت کا اظہار کر رہا ہوتا ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ تعالیٰ میرا مالک ہے' اس کے علاوہ میری بندگی کا حقدار کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سجدے کی حالت میں انسان اللہ تعالیٰ کے قریب ترین ہوتا ہے۔

بندہ جس قدر عاجز ہو کر اللہ کے حضور پیش ہوگا اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے گا۔ اپنی تمناؤں' حاجتوں اور ضرورتوں کا سوال کرتے وقت بندے کو چاہیے کہ وہ پُرامید ہو کر مانگے اور اپنی بے بسی' بے بضاعتی اور بے قراری کا پورے خلوص کے ساتھ اظہار کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ﴾ (الاعراف:۵۵) ''لوگو! اپنے رب سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کیا کرو''۔ دعا مانگتے وقت انسان کو پرامید ہونا چاہیے کہ وہ واقعی اُس ہستی کے سامنے اپنی ضرورت پیش کر رہا ہے جو ہر شے پر قادر ہے۔ گویا وہ دعا کی قبولیت کے ضمن میں پُرامید ہو۔ ہاں ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اُس کا جلال بھی پیش نظر ہو' اس کے انداز میں بیم ورجا کا پہلو ہو' یعنی وہ دعا مانگتے وقت اپنا حق نہ جتا رہا ہو بلکہ سراسر اُس کی رحمت کا امیدوار ہو اور اس کی جلالت سے خوفزدہ ہو۔ اسی حقیقت کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں دی ہے: ﴿وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ﴾ (الاعراف:۵۶) ''اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اور رحمت کی امید رکھتے ہوئے دعا کیا کرو۔''

عبد اور معبود کے رشتے کو دعا ہی مضبوط کرتی ہے: ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ کا یہی مطلب ہے۔ نماز کی ہر رکعت میں اس حقیقت کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ جس طرح ہم عبادت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اسی طرح اپنی ضرورتوں کے لیے بھی کسی دوسرے کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (الترمذی) ''دعا ہی عبادت ہے۔'' بندہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے بیم و رجا کے ساتھ دست سوال دراز کرتا ہے تو یہی عبودیت کا اظہار ہے۔ نماز بہت بڑی اور اہم عبادت ہے بلکہ مسلمان کی شناخت نماز ہے۔ اور نماز کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور دعاؤں کا مجموعہ' نیز اپنی بندگی' کمزوری اور بے بسی کا اعتراف۔ نماز کی فضیلت مسلّمہ ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ عبد اور معبود کے رشتے کا اظہار ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ جس نے نماز چھوڑی اس نے کافرانہ کام کیا۔ جب بندگی کا مستند اور محکم انداز چھوڑا تو وہ بندہ کیسے رہا۔

بندوں کو قرآن و سنت میں بتایا گیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کو یاد رکھیں' گھر سے نکلیں تو اللہ کو یاد کریں' گھر میں داخل ہوں تو اللہ کو یاد کریں' بازار جاتے وقت' سوتے وقت' نیند سے بیدار ہوتے وقت' بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت' نکلتے وقت' سواری پر بیٹھ کر' کھانا شروع کرتے وقت اور فارغ ہو کر' غرض ہر اچھا اور جائز کام شروع کرتے وقت اللہ کو یاد کریں۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے بلندیٔ درجات اور تمام مسلمانوں کے لیے بخشش کی دعا کریں۔ قبرستان جائیں تو فوت شدگان کی سلامتی کی دعا کریں۔ مختصراً اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس کا بندہ ہر وقت اس کا سوالی رہے' اپنی ہر حاجت' ضرورت اور مشکل کے وقت اسی کو پکارے۔

دعا بندے کا اور اس کے مالک کا معاملہ ہے۔ دنیا میں تو سفارشیں چل جاتی ہیں مگر دعا تو عبادت ہے' اس میں کسی تیسری ہستی کی مداخلت جائز نہیں۔ کسی صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے کہہ دیا: مَاشَاءَ اللّٰهُ وَمَاشِئْتَ ''جو کچھ اللہ چاہے اور جو کچھ آپ چاہیں''۔ اس پر آپ ﷺ نے فوراً فرمایا: ''کیا تم نے مجھے اللہ کا شریک ٹھہرا دیا!'' دُعا بلا استثناء' صرف اللہ کا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ معصوم تھے۔ اس کے باوجود آپؐ ہر روز ستّر مرتبہ یا سو مرتبہ استغفار کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ''استغفار'' صرف گناہ بخشوانے کی دعا نہیں' بلکہ دعا ہونے کے ناطے یہ اللہ کی غفاریت کا اقرار ہے جو اٹل حقیقت ہے۔ اسی لیے استغفار کے الفاظ عبادت کے مظہر ہیں اور عبادت اللہ تعالیٰ کو پسند ہے تو آپ ﷺ کا استغفار کرنا اظہارِ عبدیت اور اللہ تعالیٰ کو



راضی کرنے کے لیے تھا' نہ کہ اپنے گناہ بخشوانے کے لیے۔ استغفار عبادت ہے اور عبادت آپ کو مرغوب تھی۔

بندے کا اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے وقت کسی زندہ یا فوت شدہ ہستی کی بندگی کا سہارا لینا درست نہیں۔ قرآن مجید اور سنت میں درجنوں دعاؤں کے الفاظ ہیں' کسی دعا میں کسی دوسرے کا سہارا اختیار کرنے کا ذکر نہیں' بلکہ تمام دعائیں رَبَّنَا اور اَللّٰهُمَّ سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی اے ہمارے رب' اے اللہ..... کسی دعا میں اس طرح کے الفاظ نہیں ہیں کہ اے اللہ! فلاں کے حق کی وجہ سے میری دعا قبول فرما۔ قرآن مجید کی کسی دعا میں اور رسول اللہ ﷺ کی کسی دعا میں گزرے ہوئے پیغمبروں یا اللہ کے نیک اور مقبول بندوں (زندہ یا فوت شدہ) کو دعا میں سہارا نہیں بنایا گیا۔ خلوص فی العبادۃ کا مطلب یہی ہے کہ بندے کی عبادت بس اللہ ہی کے لیے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام درودِ ابراہیمی میں مذکور ہے۔ درود پڑھنے والا جہاں رسول اللہ ﷺ کے لیے رحمت کی دعا کرتا ہے وہاں ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھی رحمت کی دعا کرتا ہے۔ یہ ہرگز نہیں کہ درود پڑھنے والا ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو دعا کی قبولیت کے لیے سہارا تسلیم کرتا ہو یا گنہگاروں کو بخشوانا ابراہیم علیہ السلام کا حق مانتا ہو۔ مستحق بن کر اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے یا کسی دوسرے کے لیے مانگنا جائز نہیں۔ کوئی بڑا ہو یا چھوٹا' معصوم ہو یا گناہ گار سب کے سب خَوْفًا وَّطَمَعًا اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتے ہیں۔


دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے  اشاعت عام: 30 روپے

# آپ حج سے کیا لے کر لوٹے؟

نعیم صدیقی مرحوم

حج کے مبارک سفر سے سعادتوں کے ساتھ واپس آنے والے خوش قسمت برادران کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ۔ آپ کا حج اور آپ کی آمد آپ کے خاندان کے لیے‘ آپ کی قوم اور معاشرے کے لیے اور سارے عالم انسانیت کے لیے مبارک ہو!

مگر محترم بزرگو اور عزیز بھائیو! کیا آپ نے حج کو اچھی طرح جانا اور سمجھا بھی؟ اُس کا چہرہ دیکھا؟ اُس کے خدوخال کو پہچانا؟ اُس سے جو کچھ لینا تھا لیا؟ آپ اپنے ساتھ‘ اپنے اور دوسروں کے لیے کیا لے کر آئے؟ حج نے آپ سے کچھ باتیں کیں؟ اُس نے کوئی پیغام آپ کو ودیعت کیا؟ یا آپ صرف آبِ زم زم‘ کھجوریں‘ جانمازیں اور تسبیحیں لے کر آ گئے؟ یا آپ کی توجہ اصل شے مطلوب کے بجائے ریڈیو‘ ٹیپ ریکاڈر‘ قیمتی پارچات اور پھلوں کا رس نچوڑنے والی مشینوں پر مرتکز رہی؟

یہاں پہنچتے ہی آپ استقبالوں کے چکروں میں کھو گئے ہوں گے۔ آپ کی گردن ہاروں کے بوجھ سے لدگئی ہوگی۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد دیگیں پکی ہوں گی اور خاندان کے لوگ اور ملنے جلنے والے دفتری یا کاروباری احباب مبارک باد پہنچانے اور دعائیں کرانے کے لیے خوب ہجوم کر کر کے آئے ہوں گے۔ آپ کی کئی دعوتیں کی گئی ہوں گی۔ پھر دو دو‘ تین تین ماہ سے رکے ہوئے مسائل نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہوگا۔ اور آپ کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہ ملا ہوگا کہ میں حج کر کے آیا ہوں اور اب مجھے ایک نئے دور کا آغاز کرنا ہے۔ جو آپ کے بعد آئیں گے‘ اُن پر بھی یہی گزرے گی۔

بہت سے حاجی ہیں جو اگرچہ ہمیشہ حاجی کہلائیں گے‘ مگر وہ اپنے حج سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ جس دنیائے مفاد سے وہ کچھ دیر کے لیے الگ ہوئے تھے‘ وہ پہلے سے زیادہ زور کے ساتھ ان کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتی ہے‘ جن جھگڑوں کو وہ اپنے ذہن سے نوچ کر گھر سے



نکلے تھے وہ از سرِنو ان کو پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ دبوچ لیتے ہیں۔

---

اصل میں بات بڑی نازک سی ہے۔ ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ شیطان کو اذان کی آواز سخت ناپسند ہے اور وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر اس سے بھاگتا ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ وہ جب کسی شخص کو خدا کے سامنے سربسجود دیکھتا ہے تو اسے بہت ناگوار ہوتا ہے۔ ان اشاروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس قوت کا نام شیطان یا ابلیس ہے‘ وہ انسان کی ہر عبادت اور نیکی سے بے زاری رکھتی ہے۔ خصوصاً حج جیسی عظیم عبادت سے جو شخص گزر کر آ رہا ہے‘ اُس کا نام تو درخواست دینے کے دن سے ہی ابلیسی نظام کی لال کتاب میں درج ہو گیا۔ اور لازم ہے کہ اس کی شدید نگرانی کی جانے لگے اور ہر روز اس کی ڈائری لکھی جاتی ہو اور اس کے متعلق کارندوں کو احکام اور ہدایات جاری ہوں کہ کہاں کہاں کیسے کیسے اس آدمی کو خراب کیا جا سکتا ہے۔ شیاطین جن سے زیادہ ذمہ داریاں شیاطین انس کے سر ہوتی ہیں اور یہ اپنا کام دن رات جاری رکھتے ہیں۔ کچھ محبوب اور عزیز لوگ‘ کچھ کاروبار کے ساتھی‘ کچھ دفتروں کے ہم نشیں‘ کچھ گاؤں اور محلے کے خیرخواہ‘ کچھ دنیوی معاملات میں مشورے دینے والے‘ کچھ دین میں نئے نئے شگوفے نکالنے والے‘ کچھ قصیدہ خوان‘ کچھ خوشامدی‘ کچھ خدمت کیش!—— اور ان معتمد اور بے تکلف افراد کے ذہنوں میں ابلیسیت اپنی کمین گاہیں بنا کے بیٹھی ہوتی ہے اور جب کوئی مناسب مرحلہ آتا ہے تو وہ اپنا تیر چلا دیتی ہے۔ گویا یوں بھی ہر آدمی کے گرد ایک طاغوتی ’’گارڈ‘‘ متعین رہتی ہے‘ لیکن اگر شیطانی نظام کسی شخص کو ’’خطرناک‘‘ قرار دے کر درجِ فہرست کر لے تو پھر گھیرا ڈالنے والی گارد کو بھی زیادہ چوکس کر دیا جاتا ہے اور کچھ چھاپہ مار بھی خودی کو قتل اور ایمان کو مجروح کرنے کے لیے مامور کر دیے جاتے ہیں۔ پس اے حاجیٔ حرمین شریفین! ہوشیار!!

---

حج فی الواقع بہت بڑی عبادت ہے اور بہت سی عبادات کی جامع!

حج میں ہجرت کا رنگ بھی شامل ہے‘ اور جہاد کا اسلوب بھی۔ بار بار سفر بھی فی سبیل اللہ اور قیام بھی فی سبیل اللہ۔ اس میں ذکر و دعا بھی ہے اور رکوع و سجود بھی۔ مزدلفہ کی رات کی خاموش عبادت بھی اور لاکھوں کے مجمع میں یومِ عرفہ کا خطبہ بھی۔ احرام کی کفن نما پوشش بھی ہے

اور عید کا خوش آئند لباس بھی۔ وہاں آنسوؤں کی جھڑیاں بھی ہیں اور مسکراہٹوں کی کلیوں کی لڑیاں بھی۔ آدمی بیک وقت وہاں بے ہمہ بھی ہوتا ہے اور باہمہ بھی۔ تھوڑی دیر کے لیے تارکِ دنیا بھی ہوتا ہے اور پھر نئی شخصیت کے ساتھ فاتحانہ شان سے دنیا کے دروازے پر دستک بھی دیتا ہے۔ وہاں ملنے والوں سے جدا ہو کے جاتے ہیں' اور کئی بچھڑے ہوئے لوگ وہاں اچانک مل جاتے ہیں۔ حاجی کا محدود خاندان چھوٹ جاتا ہے' مگر وہ ایک نئے عالمی خاندان کا فرد بن جاتا ہے۔ بے شمار قبیلے اس کے اپنے بن جاتے ہیں' کتنے ممالک اسے اپنے ملک لگنے لگتے ہیں' مختلف بولیوں میں وہ ایک ہی جیسے معانی جھلملاتے دیکھتا ہے' وہ چوبچوں جیسی تنگ عصبیتوں اور تالاب جیسی محدود قومیت سے آگے بڑھ کر وحدت کے ایک سمندر میں شامل ہو جاتا ہے۔

---

حاجی جب اللہ اکبر کہتا ہے تو وہ یہ اقرار کرتا ہے کہ میں نے دل سے مان لیا کہ خدا ساری قوتوں سے بڑی قوت ہے' اور اُس کا دین برتر ہے' اور اُس کا قانون سب سے فائق ہے' اُس کا اقتدار سب پر غالب ہے' اور اُس کا حکم ہر طرف جاری وساری ہے۔ وہ جب لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ کہتا ہے تو دراصل اپنے آپ کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتا ہے کہ میں آپ کی پکار پر حاضر ہوں اور عمل سے اقرار کرتا ہے کہ جدھر آپ بلائیں گے' اُدھر مجھے حاضر پائیں گے' جدھر سے آپ ہٹائیں گے میں اُدھر سے ہٹ جاؤں گا۔ پھر اپنے احرام سے وہ یہ گواہی دیتا ہے کہ میں نے اپنے آپ کو موت کے اُس خط پر کھڑا کر دیا ہے جس سے مجھے ایک نہ ایک دن آگے جانا ہے اور زندگی کا حساب پیش کر کے جزا و سزا سے حصہ پانا ہے۔ وہ جب بیت اللہ نامی مکان کا طواف کر رہا ہوتا ہے تو دراصل اُس کی روح خداوند لامکانی کا طواف کر کے یہ ظاہر کرتی ہے کہ میرا مرکز و محور صرف ذاتِ الٰہی ہے' اُس کی طرف لپکنا' اُسی سے محبت' اُسی کے لیے فدائیت اور اُسی کی اطاعت! وہ جب حجرِ اسود کا استلام کرتا ہے تو دراصل اپنے ربّ والہ کے سنگ آستاں کو اُس کے جذبات چوم رہے ہوتے ہیں۔ وہ جب مقامِ ملتزم پر کھڑے ہو کر ایمان و بخشش کی دعائیں کرتا ہے اور اپنے والدین کی مغفرت کی درخواست کرتا ہے تو گویا وہ ایوانِ جاناں کی چوکھٹ کو تھامے ہوئے ہوتا ہے اور بے اختیار روتا ہے۔ وہ صفا و مروہ میں سعی کرتا ہے اور پھر لمبی پیاس کے ماروں کی طرح پیٹ بھر کر آبِ زم زم پیتا ہے۔ اگر جذبہ صحیح ہو تو یہ آبِ زم زم وجہ شفاء القلوب ہے اور قلوب اگر صحت مند ہوں تو بدن آسانی سے امراض کا شکار نہیں ہوتے۔



حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے احوال و جذبات سے حصہ پانے کے لیے صدیوں پہلے کی تاریخ کو کھینچ ملاتا ہے۔ وہ جب عرفات کے بے پایاں ہجوم میں موجود ہوتا ہے تو اُس کے سامنے میدانِ حشر کا سا نقشہ آ جاتا ہے۔ وہ قربانی کرتا ہے تو دراصل اس کا استعارہ یہ ہوتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اسی طرح احکامِ الٰہی کے تحت قربانی کے لیے پیش کر دوں گا جس طرح حضرت اسمٰعیل نے برضا و رغبت پوری شانِ صبر کے ساتھ پیش کر دیا تھا۔ نیز میں اسی طرح غلبۂ دین کے لیے اپنے بچوں کی ہلاکت کو گوارا کروں گا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائی اشارے پر اپنے محبوب اور جواں سال بچے کو نثار کر دینا بخوشی گوارا کیا تھا۔ یہاں اسے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام میں جو آدابِ فرزندی ابراہیمی تعلیم و تربیت نے پیدا کیے تھے' وہی اسے اپنی اولاد میں پیدا کرنے ہیں۔ پھر قربانی دینے کی اصل اسپرٹ یہ ہے کہ میرے دل میں جو محبتیں' جو خواہشیں اور جو امنگیں پائی جاتی ہیں ان میں سے جس کے لیے مالک کی طرف سے امتناعی حکم میرے سامنے آئے گا' میں اُسے قربان کر دوں گا۔ تب اُس کے دل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد کا صحیح مفہوم نقش ہو جاتا ہے کہ میری نماز' میری قربانی' میرا جینا' میرا مرنا سب کچھ رب العالمین کے لیے ہے۔

---

حاجی جب مقامِ ابراہیم پر نوافل ادا کرتا ہے تو اس کے کانوں میں باپ بیٹے کی دعائیں گونجنے لگتی ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۲۹﴾﴾ (البقرۃ)

''اور یاد کرو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے: اے ہمارے ربّ! ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے' تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے ربّ! ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو' ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا' اور ہماری

کوتاہیوں سے درگزر فرما‘ تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے ربّ!
ان لوگوں میں سے خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو جو انہیں تیری آیات سنائے‘ ان
کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے‘ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔‘‘

حاجی اس دعا کی صدائے بازگشت سنتے ہوئے یہ نکتہ پالیتا ہے کہ جس گھر کی تعمیر کا ذکر ہے‘ وہ حرم ہے جو اس کے سامنے ہے۔ یہ توحید پر استوار ہوا ہے۔ یہ سچے خدا پرستوں کا ایک مرکز دل ونظر ہے‘ یہ امن کا ایک سرچشمہ ہے‘ انسانیت کی پناہ گاہ ہے اور اس کی یہ شان برقرار رکھنا اصلاً اللہ تعالیٰ کے اپنے اہتمام سے ہے‘ لیکن ظاہری طور پر رسول ﷺ کے بعد پوری اُمتِ محمدیؐ کا فریضہ ہے کہ وہ خدا کے اس گھر کو طواف‘ اعتکاف اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لیے ہر قسم کے شرک کی آلائش اور ہر قسم کے فساد کی رکاوٹ سے پاک رکھیں۔

پھر اس دعا میں یہ آرزو کی گئی ہے کہ دعا کرنے والوں کو مسلم بنا۔ ایک حاجی کو بھی یہ جذبہ ان فضاؤں سے نچوڑ کر لانا چاہیے کہ وہ مسلم بن کر رہیں‘ وہ خدا کا مطیع فرمان ہو‘ وہ نہ بغاوت وسرکشی اختیار کرے‘ نہ شرک ونفاق کی راہیں نکالے۔ مسلم ہو تو حنیف ہو‘ یک سُو ہو‘ ایک ہی رب سے لو لگالے اور ایک ہی الٰہ کے جلووں سے دل کے پنہاں خانے کو روشن کرلے۔

ساتھ ہی دعا یہ بھی بتاتی ہے کہ مسلم بن کے عبادت گزارانہ زندگی گزارنے کے لیے طور طریقے مقرر کرنا اور بتانا خدا کا کام ہے۔ مانگنے والوں نے اسی سے طلب کی کہ وہ عبادت کے طریقے بتائے۔

پھر دعا کرنے والوں نے صرف اپنے لیے ہی نعمتِ اسلام نہیں مانگی‘ بلکہ اپنی نسل سے بننے والی قوم کے لیے یہ درخواست بھی کی کہ اس کو اپنا مسلم ومطیع بنائیے گا اور اُس کے اندر سے اپنا رسول مبعوث فرما کر ان کو بھی صحیح راہ عبادت اور طریقۂ اسلام بتائیے گا۔ معلوم ہوا کہ خدا کے رسول کا دامن تھامے بغیر اور اُس کی لائی ہوئی الہامی تعلیم کو قبول کیے بغیر زندگی میں نہ عبادت کا رنگ پیدا کیا جاسکتا ہے‘ نہ مسلم بن کے جینا ممکن ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ رسول آئے اور خدا کی آیات بندوں تک پہنچائے‘ ہدایت اُن کو پڑھ کر سنائے‘ پھر خدا کی کتاب اور حکمت دین کی اُن کو وسیع تر تعلیم دے‘ پھر اُن کی زندگیوں کو فکری واعتقادی لحاظ سے بھی اور اخلاقی‘ معاشی اور سیاسی لحاظ سے بھی سنوارے۔

معمارانِ کعبہ کی یہ دعا تو پوری ہوچکی کہ خدا کا آخری رسول ﷺ شہر حرم ہی میں مبعوث ہو چکا۔ وہ خدا کی کتاب سونپ گیا۔ وہ آیات پڑھ کر سنا گیا۔ اس نے کتاب وحکمت کی تعلیم



۲۳ برس کے وسیع زمانے میں نئی صورتِ حالات کے اندر دی۔ اس نے زندگیاں سنوار کر نہ صرف اعلیٰ درجے کے افراد ہزارہا کی تعداد میں پیدا کر کے دکھائے‘ بلکہ ایک معاشرہ بنا کر اور ایک ریاست چلا کر بھی دکھا دیا۔ یعنی انفرادی مسلمانی اور اجتماعی مسلمانی ساتھ ساتھ نشوونما پاتی گئیں۔

اب تو سوال صرف یہ ہے کہ ہم سب مسلمان اس تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ حیات سے سبق لے کر اپنی اور معاشرے کی زندگی کو کیسے اسلامی زندگی بناتے ہیں۔

میرے محترم اور پیارے حجاج بھائیو! یہ فریضہ آپ سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ توجہ چاہتا ہے۔ کیا آپ اس فریضے کی ادائی کے لیے تیار ہیں؟

---

شعائرِ حج کا ایک اہم موقع وہ ہے جب آپ شیطانوں کو کنکریاں مار رہے تھے۔ کیا اُس وقت آپ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ شیطان بس یہ تین ہیں‘ جو بُرجیوں کی شکل میں آپ کے سامنے ہیں؟ آپ کو یہ مغالطہ تو نہیں ہوا کہ شیطان صرف خارج ہی خارج میں ہوسکتا ہے؟ کچھ آپ کو احساس ہوا کہ آپ کے گرد اور آپ کے اندر گھس کر شیاطین ساری عمر شرپسندانہ حرکات کرتے رہے ہیں؟ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کی کچھ خواہشیں اور جذبے ہیں‘ جنہیں ضرورت سے زیادہ اُکسا کر وہ آپ کو ایسی کشمکش میں مبتلا کرتے رہے ہیں جو کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ طور پر آدمی کو غلط سمت میں لے جاتی ہے؟ کیا آپ کے تصور میں یہ بات بھی آئی کہ یہاں سے پلٹ کر آپ کا سابقہ پھر انہی شیاطین سے پڑے گا اور آپ کی پھینکی ہوئی کنکریاں اُس وقت تک ان کو سنگسار نہیں کرسکتیں جب تک کہ آپ کچھ کنکریاں اپنے دل ودماغ کے غلط رجحانات پر اور اپنے اعزّہ واحباب کی غلط خواہشوں اور نظریات کو بھی نہ ماریں؟ کیا کبھی پہلے اِدھر بھی کوئی کنکری آپ نے پھینکی؟ یا کم از کم کیا اب شیطانوں کی رمی کے ظاہری عمل سے سبق لے کر زندگی کی حقیقی مفسدہ انگیز قوتوں کے خلاف رمی کرنے کا ارادہ ہے؟

اگر زندگی کی فاسد ومفسد قوتوں کے خلاف —— خواہ وہ قلبی وذہنی ہوں یا خارجی‘ انفرادی ہوں یا اجتماعی‘ افکار کے میدان میں کام کریں یا اعمال کے دائرے میں —— آپ سنگباری کا سبق وادیٔ محسّر سے سیکھ آئے ہیں تو آپ نے حج کی رُوح پالی۔

---

آپ جس معاشرے کو چھوڑ کر گئے تھے اور جس میں واپس لوٹے ہیں‘ اس کے احوال پر

ذرا غور سے نگاہ ڈالیے۔

یہاں دین سے عملی وابستگی رکھنے والوں اور سچے خدا پرستوں کی بہت کم تعداد پائی جاتی ہے۔ یہاں عظیم معلّم توحید حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واضح کردہ مسلک کے مطابق ہر طرف سے منہ موڑ کر اور صرف خدائے واحد کی عبادت و اطاعت میں لگ جانے والوں اور شرک اور نفاق اور تضاد اور دوعملی و دورنگی سے پاک افراد آٹے میں نمک کی طرح ہیں۔ اسلامی تقریروں' اسلامی کتابوں' اسلامی تقریبوں' اسلامی میلوں' اسلامی عرسوں' اسلامی جلوسوں' اسلامی مشاعروں' اسلامی ''یوموں'' اور اسلامی نعروں کے خوش نما غلافوں کو دیکھ کر ہم سب کی طبیعتیں بہلتی ہیں' مگر غلافوں کو ہٹائیں تو نیچے تو کھلی لادینیت ملتی ہے' کہیں بے قید سیکولر زندگی' کہیں مختلف آلائشوں کے ساتھ پائی جانے والی مذہبیت' کہیں تعصّب و تحزّب کے مارے ہوئے فرقوں کے مناظرانہ محاذ!

یہی وجہ ہے کہ مسلمان وہ فارمولا ہی بھول گئے جس کے تحت متفرق اختلافات کے باوجود اصولوں پر مبنی وحدت قائم رہتی تھی اور ایک خیال کا مسلمان دوسرے نقطۂ نظر کے مسلمان کے لیے سچا جذبۂ اخوت رکھتا تھا۔

مسئلہ صرف پاکستان ہی کا نہیں' سارے عالمِ اسلام کی حالت یکساں ہے۔ فرد افراد سے' خاندان خاندانوں سے' سیاسی گروہ سیاسی گروہوں سے' قائدین قائدین سے' مذہبی جتھے دوسرے مذہبی جتھوں سے' جمہور حکمرانوں سے اور حکمران جمہور سے برسرِ کشمکش ہیں' ہر کوئی اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونسنا چاہتا ہے۔ کوئی روحانیت کے زور سے' کوئی علم کے زور سے' کوئی دولت کے زور سے' کوئی جتھا بندی کے زور سے اور کوئی قانون اور عہدے کے زور سے! نتیجہ ہر سطح پر' ہر دائرے میں معاشرے کی شکست و ریخت ہے۔

آپ کا یہ معاشرہ دولت پرستی اور آسائش پسندی اور معیار پرستی میں اتنی دور نکل گیا ہے کہ معاشرت کی اکثر و بیشتر پگڈنڈیاں اب حرام کی وادی سے گزرتی ہیں۔ آج رزقِ حلال کا حصول انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔

امتحانات میں' تعلیم گاہوں کے داخلوں میں' ہسپتالوں میں جگہ کے حصول اور پھر عملے کی توجہ اور دواؤں کے حصول میں' مختلف بھرتیوں میں' بھرتیوں کے انٹرویوز میں' تبادلوں اور ترقیوں میں' مواقع مفاد تک رسائی میں ہر جگہ خیانت کی چوکیاں قائم ہیں۔ عوام کے لیے فارم بازی بڑھ گئی ہے اور وہ سال میں کئی کئی بار اور کئی کئی دن دفتروں کے چکر لگاتے ہیں اور ہر



چکر میں کچھ مال پلّے سے دیتے ہیں' کچھ تکلیف اٹھاتے ہیں' کچھ عزت گنواتے ہیں۔

خیانت کی اس وبا میں اضافے کی ایک وجہ یہ ہے کہ قوم گرانی کے ساتھ ساتھ پانی اور بجلی اور سوئی گیس کے بڑھتے ہوئے نرخوں کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہے اور ٹیکسوں میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

زندگی کا ایک ایک لمحہ گزارنا خاراشگافی اور کوہ کنی کا تقاضا کرتا ہے۔

آپ کے معاشرے میں بے پردگی کا رجحان بڑھ رہا ہے' فحاشی کے سرچشمے جاری ہیں۔

آپ کے معاشرے میں جرائم بڑھ رہے ہیں' نہایت وحشیانہ تشدّد اور سیاسی قتل کے حوادث بار بار ہونے لگے ہیں۔ محافظِ امن اداروں کی طرف سے جو تحفّظ عوام کو حاصل تھا' روز بروز کم ہو رہا ہے۔ ہر آدمی کو خوف اپنے پنجوں میں دبوچ رہا ہے۔

ان حالات میں زندگی کی الجھنیں بڑھ گئی ہیں' انسانی رابطوں میں کمی آ رہی ہے اور ہر فرد تنہا ہوتا جا رہا ہے۔ اس تنہائی کے عالَم میں اس کے اعصاب ذہنی اور معاشی بوجھ میں مسلسل اضافے سے چٹخنے لگے ہیں۔ ہر شخص پریشانیوں اور اضطرابات میں گھرا ہوا ہے۔ ان وجوہ سے اعصابی خلل' دماغی اضمحلال' خون کے دباؤ کی کمی بیشی اور دل کے دوروں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

محترم حاجیانِ حرمینِ شریفین! اب آپ آئے ہیں تو اپنے اس مصیبت زدہ معاشرے پر رحم کھا کر کوشش کیجیے کہ یہاں خدا پرستی' رزقِ حلال اور اطمینانِ قلب کا دور دورہ ہو۔ اس مقصد کے لیے آپ کام کرنے کی راہیں تلاش کریں۔ کچھ نُور اگر آپ نے دورانِ حج حرم سے حاصل کیا ہے تو اب قوم کی تاریکیوں میں اسے پھیلانے کی فکر کیجیے۔ کچھ دوڑ دھوپ کیجیے' کچھ تگ و تاز کیجیے' دروازے کھٹکھٹائیے' نیک روحوں کو پکاریئے' مئے سکینت کے خموں کے دہانے کھول دیجیے۔ الحاد اور لادینیت' حرام خوری اور تنگیٔ معیشت' بے حجابی اور بدقماری کے خلاف ایک محاذ آراستہ کیجیے۔ مخالفِ اسلام نظریات اور رسوم و اطوار کو چیلنج کیجیے۔ پاکستان کی وحدت و سالمیت کے مخالفوں اور غایتِ پاکستان کے دشمنوں کے ہاتھ پکڑ لیجیے۔

کیا حج سے حاصل کردہ اسپرٹ آپ کو اس جہادِ عظیم کے لیے نہیں پکارتی؟

---

کتنی عجیب بات ہے کہ کسی قوم کے کئی ہزار افراد ہر سال حج کر کے آتے ہوں اور پھر بھی اس کے اعتقادی اور اخلاقی احوال خراب رہیں۔ اگر پاکستان بننے کے بعد ۳۵ سال تک حج

کرنے والوں میں سے صرف ایک ہزار بیدار دل حاجی بھی ہر سال میدان میں اتر جاتے اور ہر سال ایک حاجی دس افراد کے سینوں میں ایمانِ باعمل کی شمعیں فروزاں کر دیتا تو خدا پرست‘ محبت کیش‘ نصفت شعار لوگوں کی ایسی صفیں کی صفیں تیار ہو جاتیں جو اسلام کو ایک زندہ قوت میں بدل سکتی تھیں۔

اگر آپ ہمارے ذہنی احوال کو دیکھیں تو ہم میں بے حسی بھی ملے گی‘ جمود بھی ملے گا‘ بے روح اعتقادات ملیں گے‘ ان پر مناظرانہ بحثیں ملیں گی‘ رسمیات کی ایک مستقل شریعت ملے گی‘ شرک و بدعت کے مظاہر ملیں گے۔ اسی طرح معاشی زندگی میں ایک طرف فاقہ مستیاں اور دوسری طرف چیرہ دستیاں‘ ایک طرف بے روزگاری اور دوسری طرف اسراف و تبذیر‘ ایک طرف مجبوری و بے بسی اور دوسری طرف ظلم و تشدد‘ دفتری زندگی میں کام چوری اور رشوت‘ کاروبار میں چور بازاری اور ملاوٹ اور گراں فروشی‘ سماجی طور سے غلاظت و جہالت اور بیماری و بدکاری‘ امن کے پہلو سے جرائم اور لوٹ مار۔ آخر اس فضا کو بدلنے کے لیے ہمارے لاکھوں حاجیوں کا حج انقلاب آفرین کیوں نہیں بنتا۔

کلمہ ایک انقلابی نور ہے‘ اذان انقلابی پکار ہے‘ نماز روزہ انتہائی انقلاب انگیز عبادتیں ہیں‘ صدقہ خدائی انقلاب کے علمبرداروں کی توانائی ہے—— اور حج جو بہت سی عبادات کا جامع ہے‘ وہ تو تاریخ میں بہت عظیم مدوجزر پیدا کرنے والی طاقت ہے۔ تبدیلی نہ کلمے میں آئی ہے‘ نہ اذان اور نماز میں‘ نہ روزہ و صدقہ میں‘ اور نہ حج و قربانی میں‘ البتہ جمود آفریں تبدیلی خود ہمارے اندر آئی ہے۔ زندگی کے تمام خدوخال متحجر ہو گئے ہیں۔ تحریکیت کا سیلابی دریا یخ بستہ ہو گیا ہے۔ برودت یہاں سے وہاں تک چھائی ہوئی ہے۔

پیارے حاجیو! اس روگ کا کچھ درماں کرو‘ اور جو کوئی ایسی فکر و کاوش کرتا ملے‘ اس کی قوتوں کے ساتھ اپنی قوتیں ملا دو!

پھر یہ ساری وادیٔ ملت جاگ اٹھے گی‘ سل پتھر بنے ہوئے پیکر زندہ ہو جائیں گے‘ قبروں سے مُردے کفن پھاڑ کر سر ابھاریں گے‘ ذرّے کروٹ لے کر آفتاب بن جائیں گے اور چاروں طرف اُجالا پھیل جائے گا۔

---

مگر یہ سب کچھ کیوں نہیں ہوتا!



اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حج اور شعائرِ حج کی حقیقت کا پوری طرح شعور نہیں ہوتا۔ چنانچہ کتنے ہی طائفین حرم ہیں جو واپس آ کر پھر وہی کے وہی کام کرنے لگ جاتے ہیں‘ انہی نزاعات میں پڑ جاتے ہیں۔ مفاد کے اسی چھکڑے میں آ کر جُت جاتے ہیں اور حج کے تموجات کے بعد اپنی سطح اسی طرح ہموار کر لیتے ہیں جیسے سب کچھ پہلے تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر حاجی مطمئن ہو کر لوٹتے ہیں کہ اگلے پچھلے گناہ معاف ہو گئے اور اب ان کی روح ٹھیک ٹھاک ہو گئی ہے‘ لہٰذا وہ دوبارہ اپنی دنیا کی دلفریبیوں میں مگن ہو جاتے ہیں‘ بلکہ حاجی ہونے کے بعد انہیں اور زیادہ تسلی ہو جاتی ہے کہ کاروبار‘ ملازمت یا سماجی معاملات کی خرابیوں کو ڈھانپنے کے لیے ایک اچھا زرکار غلاف ان کو میسر آ گیا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض حاجیوں میں اپنے متعلق ایک طرح کا احساسِ عظمت و افتخار پیدا ہو جاتا ہے۔ کچھ ان کے گرد و پیش کے لوگ اور ان کا گھریلو اور سماجی ماحول بھی ان کے احساسِ افتخار کو پرورش دیتا ہے‘ حتیٰ کہ بعض لوگ تو مقامِ کبر تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ اپنے حلقے میں دینی اتھارٹی بن جاتے ہیں۔ دوسروں کو ٹوکتے ہیں مگر ان کو ٹوکنے کی جرأت کوئی نہیں کرتا۔ یہ پندار بعدِ حج کی برکات کے حصول میں حجاب بن جاتا ہے۔ پھر نہ ان کی ذات میں کوئی تبدیلی آتی ہے‘ نہ وہ اپنے گھر کے ماحول کو سنوارنے کی فکر کرتے‘ نہ کاروبار کا نقشہ بدلتے ہیں‘ نہ عادات و اطوار کے برے پہلوؤں کو چھانٹ کر ان کو نئی ترتیب دیتے ہیں‘ نہ ہی وہ قومی‘ ملکی اور ملی مسائل میں راہِ حق کی تلاش کے لیے فکرمند ہوتے ہیں۔

چوتھی وجہ کچھ لوگوں کی حد تک یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ حج کے بعد مکمل طور پر دُنیوی مشاغل کو ترک کر کے جانماز اور تسبیح کو سنبھال لیتے ہیں۔ اُن کی تسبیح اور جانماز کے حلقے کے باہر کی دنیا ایمانی و اَخلاقی طور پر تباہ ہوتی رہے تو وہ بے نیاز رہ کر اپنی عاقبت سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ خاص طور سے وہ حضرات جن کی اولادیں اور گھر کے لوگ ان کو بڑی خوش اسلوبی سے عملی زندگی سے ریٹائر ہو جانے کے مشورے دیتے رہتے ہیں‘ حج کے بعد وہ دکان‘ دفتر‘ کھیت سے انہیں بے تعلق کرنے کے لیے نہایت درجہ ادب و احترام کے انداز سے بہت آرام دہ حالات میں اللہ اللہ کرنے کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ اِس طرح وہ قوت جو ہر سال حج سے پیدا ہونی چاہیے‘ وہ اصلاحِ زندگی کے کام کے لیے غیر مؤثر بن جاتی ہے۔

(باقی صفحہ 92 پر)

---

# اخلاصِ نیّت اور ریاکاری (۲)

جمیل الرحمٰن عباسی

## ریا کے بارے میں حساسیت

ریا سے بچاؤ کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس کے بارے میں بہت حساسیت کا مظاہرہ کرے۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہنا چاہیے کہ کہیں مجھ سے ریا تو نہیں ہوگئی‘ کہیں میرے اعمال معیارِ قبول پر پورا اترنے سے رہ تو نہیں گئے۔ یہ حساسیت شریعت کی نظر میں عین مطلوب ہے۔

سورۃ المؤمنون میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی چند صفات نقل کی ہیں‘ ان میں سے ایک یہ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ (آیت ۶۰) ’’وہ لوگ دیتے ہیں جو دیتے ہیں اور ان کے دل ڈرتے رہتے ہیں‘‘۔ ڈرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان سوچے کہ پتا نہیں میرا یہ عمل قابل قبول ہے بھی کہ نہیں‘ کہیں میرے خلوص و اخلاص اور نیت میں کوئی خامی تو نہیں رہ گئی‘ یا پھر یہ کہ فقہی اعتبار سے اس کام کے ارکان و شروط میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: کیا یہ لوگ چوری کرتے یا شراب پیتے تھے کہ جس پر وہ ڈرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اے ابوبکر کی بیٹی! ایسا نہیں ہے‘ بلکہ یہ تو وہ لوگ ہیں جو نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں اور پھر ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ ان سے قبول ہی نہ کیا جائے۔ یہی لوگ نیکیوں میں جلدی اور سبقت لے جانے والے ہیں‘‘۔ (سنن الترمذی)

پس انسان اپنے اعمال خصوصاً نیت کے اعتبار سے ڈرتا رہے اور اسے بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ قرآن کے سیاق اور اس حدیث سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حساسیت کا یہ رویہ انسان کو نیکیوں کی سبقت کی طرف لے جاتا ہے۔ جیسا کہ امام رازیؒ نے صراحت کی ہے کہ یہ آیت ترکِ ریا پر دلالت کرتی ہے اور اطاعت گزاری کے ساتھ اعمال کے قبول نہ ہونے کا خوف انسان کو صدیقین کے مقام تک پہنچا سکتا ہے۔ (تفسیر کبیر) فُضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ انسان کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک وہ اللہ کے عائد کردہ فرائض ادا نہ



کرے اور محرمات سے نہ بچے۔ اللہ کے دیے پر راضی رہے اور اس کے بعد بھی ڈرتا رہے کہ مبادا یہ مجھ سے قبول نہ کیا جائے۔ (شرح صحیح البخاری لابن بطال)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود اپنے بارے میں نفاق کا اندیشہ رکھتے تھے تو ہم ان سے بڑھ کر اس اندیشے کے مستحق ہیں۔ ابن ابی ملیکہؒ کہتے ہیں کہ میں نے تیس صحابہ کرامؓ کو پایا ہے‘ ان میں سے ہر ایک خود پر نفاق کا اندیشہ رکھتا تھا اور ان میں سے کوئی بھی یہ نہ کہتا تھا کہ وہ جبریلؑ اور میکائیلؑ کے ایمان پر ہے۔ امام بخاری نے اس قول پر جو عنوان باندھا ہے وہ بھی بہت معنی خیز ہے: خَوْفِ الْمُؤْمِنِ مِنْ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ ’’مؤمن کا یہ خوف رکھنا کہ اس کے اعمال ضائع ہو جائیں اور اسے خبر بھی نہ ہونے پائے۔‘‘

## ریا کی پہچان

ریا سے بچنے کے لیے اولاً اس کی پہچان ضروری ہے‘ جو بعض اوقات بہت مشکل ہوتی ہے‘ اس لیے کہ یہ شرک ہی کی ایک قسم ہے جس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اے لوگو! شرک سے بچو‘ وہ تو چیونٹی کی آہٹ سے بھی زیادہ پوشیدہ چیز ہے‘‘۔ (مسند احمد) دوسری حدیث کے مطابق ’’شرک اندھیری رات میں ایک چٹان پر ایک چیونٹی سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے‘‘ (مستدرک حاکم)۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ ’’میری اُمت میں شرک‘ ایک اندھیری رات میں چٹان پر چلتی چیونٹی کی آہٹ سے بھی زیادہ خفی ہوگا۔‘‘ (جامع الکبیر)

فرمانِ نبویؐ کے مطابق چونکہ ریا شرکِ اصغر ہے لہٰذا اس کی پہچان عام شرک سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اس کی چند نشانیاں درج ذیل ہیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ریاکار کی تین نشانیاں ہیں: ’’جب اکیلا ہوتا ہے تو اس کے اندر عبادت میں سستی آتی ہے‘ جب لوگوں کے درمیان ہو تو نشاط کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ تعریف کی جائے تو عمل میں اضافہ کرتا ہے اور اگر اس کی مذمت کی جائے تو اس کا عمل گھٹ جاتا ہے‘‘۔ (الزواجر عن اقتراب الکبائر) فرمانِ علیؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلانیہ اور پوشیدہ عبادت میں فرق اور تعریف و تنقید سے متاثر ہونا‘ ریا کی نمایاں نشانیاں ہیں۔

## سستی و نشاط کی وضاحت

ذہن میں رہنا چاہیے کہ سستی اور نشاط کی مختلف اقسام یا وجوہات ہوسکتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو ریاکاری نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے ان کی گہرائی میں جا کر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سستی کی ایک قسم تو یہ ہے کہ انسان لوگوں کے سامنے عبادت کرے لیکن تنہائی میں سرے سے عبادت ہی نہ کرے۔ اس صورت میں اگر سستی انسان کی نیت میں ہو کہ اب لوگ نہیں دیکھ رہے تو عبادت کرنے کی ضرورت نہیں ہے' تو یہ عین ریا کاری ہے۔ اور اگر سستی انسان کے عمل میں ہو' یعنی نیت تو عمل کرنے کی ہو لیکن سستی اور کسل مندی کی وجہ سے کرنے کی نوبت نہ آئے یا مثلاً نماز یا روزے کے لیے بروقت بیدار نہ ہو سکے تو یہ ریا کاری نہیں بلکہ تساہل ہے۔ البتہ اگر ایسی صورت میں انسان کو عمل نہ کرنے پر ندامت اور ملال نہ ہو بلکہ اس صورتحال پر مطمئن ہو کر رہ جائے تو اس صورت میں یا تو ظاہری عبادات میں کچھ ریا کا شائبہ پایا جاتا ہے یا پھر انسان کے ریا میں ملوث ہو جانے کا قوی خطرہ موجود ہے۔

**سستی کی دوسری قسم:** سستی کی دوسری قسم یہ ہے کہ انسان لوگوں کے سامنے عبادت اچھی طرح انجام دے اور خشوع و خضوع کا مظاہرہ کرے لیکن تنہائی میں خشوع اور عبادت کی عمدگی کا اہتمام نہ کرے تو یہ بھی ریا کاری ہی کا ایک مظہر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگوں کے سامنے نماز اچھی طرح پڑھے اور جب اکیلا ہو تو برے انداز سے پڑھے تو وہ اپنے اس عمل سے اللہ کی اہانت کر رہا ہے''۔ (شعب الایمان)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! پوشیدہ شرک سے بچو! اور پوشیدہ شرک یہ ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو اور لوگوں کی نظر کا خیال کرتے ہوئے وہ اپنی نماز کو خوبصورت بنائے (دوسری روایت میں ہے کہ رکوع و سجود اچھی طرح کرے) تو یہ پوشیدہ شرک ہے''۔ (شعب الایمان)

**ایک استثناء:** خلوت و جلوت کی عبادت کے مندرجہ بالا فرق کے ریا ہونے کے اصول میں ایک استثناء بھی ہے جس کا ذکر امام غزالیؒ اور دوسرے علماء نے کیا ہے۔ وہ یہ کہ بعض اوقات تنہائی کی عبادت کے مقابلے میں مجلس کی عبادت کیفیت یا کمیت کے اعتبار سے بہتر ہوتی ہے' لیکن اس کے باوجود اسے ریا نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان نیک لوگوں کی صحبت کے زیر اثر نیکی میں آگے بڑھے۔ ظاہر ہے یہ ریا نہیں بلکہ یہ نیک صحبت کی وہ ناگزیر تاثیر ہے جس سے ہر انسان متاثر ہوتا ہے' جیسا کہ سیدنا حنظلہ بن الربیع رضی اللہ عنہ کو خود پر نفاق کا اندیشہ پیش آیا کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ان کی ایمانی کیفیت جو بن پر اور اپنے اہل اعیال کے پاس جا کر زوال پذیر ہو جاتی تو وہ پریشان ہو جاتے اور انہیں نفاق کا اندیشہ دامن گیر ہو جاتا۔ چنانچہ وہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ نبی اکرم ﷺ سے دریافت کرنے حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کے اس خیال کی نفی فرمائی اور کہا کہ ''یہ تو وقت وقت کی بات ہوتی ہے''۔



(صحیح مسلم) پس کسی شخص کی عبادت کی کیفیت و کمیت نیک لوگوں کی محفل میں جا کر بہتر ہو جائے تو اسے ریا نہیں بلکہ صحبت کا اثر کہا جائے گا۔

اس کے برعکس یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ انسان دنیاداروں کی کسی محفل میں جا کر عبادت کا زیادہ شوق و اہتمام کا مظاہرہ کرے۔ اس صورت میں ریا کا کافی امکان پایا جاتا ہے' کیونکہ ایسی محفل میں ترغیب و تشویق یا تاثیر صحبت کا بھی کوئی اہتمام نہیں ہے۔

## لوگوں کی تعریف و مذمت کی حقیقت

چونکہ ریا میں اصل خیال لوگوں کا ہوتا ہے اور ریا کار لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہے چنانچہ وہ لوگوں کی تعریف کا مستحق بننا اور مذمت سے محفوظ رہنا چاہتا ہے۔ پس وہ تعریف و مذمت دونوں کا خاص اثر قبول کرتا ہے۔ نیکی کے کام پر تعریف کی جائے تو وہ اس کے اہتمام میں خوب بڑھ جاتا ہے اور اگر اسی کام پر اس کی مذمت کی جائے تو اس کام سے پسپائی اختیار کر لیتا ہے۔

اس ضمن میں یہ حقیقت انسان کو اپنے سامنے رکھنی چاہیے کہ کسی کی تعریف انسان کو کچھ نہیں دے سکتی اگر وہ اللہ کی نگاہ میں بھی ایسا ہی نیک نہ شمار ہو' اور کسی کی مذمت انسان کے لیے باعث نقصان نہیں جبکہ اللہ کے ہاں وہ برا نہ شمار ہو رہا ہو۔ فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں: ''اگر تمہاری تعریف نہ کی جائے بلکہ تمہاری مذمت ہی کی جائے تو کوئی حرج نہیں بشرطیکہ تم اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہو۔'' (احیاء العلوم) اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ جب ایک وفد کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے تو قبول اسلام سے قبل کی گفتگو کے دوران کہنے لگے: اِنَّ حَمْدِی زَیْنٌ وَاِنَّ ذَمِّی شَیْنٌ ''بے شک میرا تعریف کرنا دوسروں کے لیے باعث زینت و شان ہے اور میرا مذمت کرنا دوسروں کے لیے باعث ننگ ہے''۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو صرف اللہ ہی کا معاملہ ہے۔'' (سنن الترمذی)

یعنی تمہاری مذمت و تعریف کی کوئی حیثیت نہیں' بلکہ اللہ کی تعریف ہی ایسی ہے جو اگر مل جائے تو قابلِ فخر ہے اور اللہ ہی کی مذمت ایسی ہے کہ اگر کسی کی کی جائے تو اس کے لیے باعث ننگ و شرم ہے۔ اس حدیث کو سامنے رکھنے سے انسان دنیا والوں کی تعریف یا تنقید سے مستغنی ہو سکتا ہے۔ اللہ درجات بلند کرے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے' ایک موقع پر ایک صاحب نے ان کی دینی خدمات پر ان کی تعریف شروع کر دی تو انہوں نے جواب دیا: ''آپ جو اعتراف کر رہے ہیں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے' ہاں اللہ قبول کر لے تو بیڑا پار ہے''۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسا ہی طرز عمل اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

## تعریف پسندی سے بچاؤ

تعریف پسندی سے بچنے کے لیے اس کے نقصانات اور وارد شدہ مذمت کو یاد رکھنا چاہیے۔ اس کا بڑا نقصان یہ ہے کہ تعریف کی خواہش انسان پر غالب آ کر پھر رفتہ رفتہ دکھلاوے تک پہنچا دیتی ہے۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کی تعریف کی چاہت انسان کو اندھا بہرا بنا دیتی ہے''۔ (الجامع الصغیر) ایک حدیث میں آتا ہے کہ ''اللہ کی اطاعت کے کاموں کو لوگوں کی تعریف کے ساتھ ملانے سے بچو ورنہ تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا۔'' (الجامع الکبیر) عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ ایک آدمی اللہ کی رضا کے لیے نماز پڑھتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی پسند کرتا ہے کہ اس کی تعریف کی جائے تو اس کے بارے میں فرمائیں؟ انہوں نے جواب دیا: ''اس کی نماز میں سے اسے کچھ نہ ملے گا''۔ (تفسیر ابن کثیر) ایک روایت کا مفہوم یہ ہے کہ جو نیک کام پر اپنی تعریف چاہے گا اس نے شکر کا موقع ضائع کر دیا۔ (الجامع الکبیر) حقیقت یہ ہے کہ انسان کو جس نیکی کی بھی توفیق مل جائے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے' اس پر انسان کو اللہ کا شکر گزار بننا چاہیے۔ اب اگر وہ اللہ کی تعریف و حمد کے بجائے اپنی مدح سرائی چاہتا ہے تو اس نے شکر کا موقع ضائع کر دیا۔

## بغیر چاہے تعریف مل جانا

ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان لوگوں کی تعریف نہ چاہتا ہو لیکن لوگ اس کی تعریف کر گزریں' ایسی تعریف سے ثواب ضائع نہیں ہوتا۔ نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک آدمی نیکی کا ایک کام اللہ ہی کے لیے کرتا ہے اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں تو یہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو بندۂ مؤمن کو جلد ملنے والی بشارت ہے۔'' (صحیح مسلم) ملا علی قاریؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ چونکہ یہ شخص ریا کار نہیں ہے' پس اصل بشارت اور انعام تو اسے آخرت میں ملے گا جو اس کا اصل مقصود ہے' لیکن اس طرح دنیا ہی میں اللہ نے یہ کچھ خوشی اسے دے دی۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ''تعریف یا تو دُنیوی سامان وخوبی میں کی جاتی ہے یا دینی امور و صفات میں۔ پس اگر دُنیوی اُمور میں کی جائے تو انسان سوچے کہ دُنیوی چیزوں کی اپنی ہی کوئی حقیقت نہیں ہے کجا یہ کہ ان کی تعریف پر خوش ہوا جائے۔ اور اگر دینی امور میں تعریف کی جائے تو انسان یہ خیال کرے کہ کامیابی صرف نیکی کر گزرنے میں نہیں بلکہ اسی نیکی پر خاتمے میں ہے اور چونکہ مجھے اپنے خاتمہ کا معلوم نہیں لہٰذا اس پر خوش ہونا بھی روا نہیں ہے''۔ (احیاء العلوم)



تعریف کے فتنے سے بچنے لیے اس کا استحضار رکھنا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ نے تعریف کو پسند نہیں فرمایا بلکہ گردن کاٹنے' کمر توڑنے' ذبح کرنے کے برابر اور تعریف کرنے والوں کے منہ کو مستحق خاک قرار دیا ہے۔ (بخاری' مسلم' ابن ماجہ)

پس جب بھی تعریف کی جائے تو ان القابات کو ذہن میں لانا چاہیے۔ نیز یہ کہ دل ہی دل میں اللہ کا ذکر کرنا چاہیے۔ اسی طرح اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو تصور میں لانا بھی فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی منہ پر تعریف کر دے تو اس کے مضر اثرات سے بچنے کی ماثور دعا کرنی چاہیے:

((اَللّٰھُمَّ اَنْتَ اَعْلَمُ بِیْ مِنْ نَفْسِیْ ' وَاَنَا اَعْلَمُ بِنَفْسِیْ مِنَ النَّاسِ' اَللّٰھُمَّ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا یَقُوْلُوْنَ وَاغْفِرْلِیْ مَا لَا یَعْلَمُوْنَ ' وَاجْعَلْنِیْ خَیْرًا مِمَّا یَظُنُّوْنَ)) (کنز العمال و شعب الایمان)

## اقسامِ مذمت اور مطلوبہ طرزِ عمل

مذمت کے بارے میں یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ وہ تین طرح کی ہو سکتی ہے' ایک تو یہ کہ مذمت کرنے والا جس بات پر مذمت کر رہا ہے وہ بات واقعی ہمارے اندر پائی جائے۔ مذمت کرنے والا اگر ہماری اصلاح کی نیت سے ایسا کر رہا ہو تو یہ عین مطلوب ہے۔ پس اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تنقید تو حقیقی عیب پر کی جا رہی ہو لیکن ناقد کا مقصد اصلاح کے بجائے محض اپنی بڑائی جتلانا یا دوسرے کی تذلیل ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تنقید میں مخلص اور حق بجانب ہو لیکن اس کا انداز غیر مناسب ہو' ان تمام صورتوں میں ناقد کا شکر گزار ہونا چاہیے' کیونکہ اس کے اس طرزِ عمل سے اصلاح کی امید ہے جو آخرت کے اعتبار سے بہت بڑی نعمت ہے۔ پس ایسے ناقد کو اپنا محسن سمجھا جائے' جیسا کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان بیان کیا جاتا ہے کہ ''جو میری غلطی مجھ پر واضح کرے گا وہ میرا محسن ہے''۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ہماری ایسی باتوں پر مذمت کی جائے جو ہم میں ہیں ہی نہیں اور مذمت کرنے والا محض جھوٹ اور افترا سے کام لے رہا ہو تو باوجود اس کے ایذا انگیز ہونے کے یہ آخرت کے اعتبار سے بہتر ہے' کیونکہ اس میں انسان کی غلطیوں اور گناہوں کا کفارہ حاصل ہوتا ہے۔ اگر ناقد وضاحت کا موقع دے تو مناسب انداز میں وضاحت بھی کرنی چاہیے۔ مزید یہ کہ انسان کو اس حال میں اپنے ان عیوب کو یاد کرنا چاہیے جو اس کی ذات میں موجود ہیں۔ اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس کے حقیقی عیوب پر اللہ نے پردہ ڈالے رکھا۔

چاہیے کہ انسان دوسروں کی مذمت سے خوفزدہ نہ ہو بلکہ اس کا استقبال کرے اور اسے اپنے لیے فائدہ مند سمجھے۔ تنقید و مذمت کے خوف سے چھٹکارا پانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان خود اپنی مذمت کرے۔ البتہ علماء نے اس کے چند صحیح طریقے یہ بیان کیے ہیں: تنہائی میں اپنے گناہوں اور دیگر نقائص کو یاد کر کے خود کو ملامت کرنا اور اللہ کی جناب میں معافی کی طلب و اصلاح کی توفیق کرنا' اگر کوئی غلطی ہو جائے تو دریافت کرنے پر اپنی غلطی کا اعتراف کرنا' کسی کے حق میں کوئی غلطی ہو جائے تو اس سے معذرت کرنے میں جلدی کرنا' اپنے حقیقی نقائص کی اصلاح کے لیے دوسروں سے مشاورت اور رہنمائی طلب کرنا۔ بعض اوقات اگر کسی خاص انسان کے اچھا سمجھنے کی وجہ سے ریا کا اندیشہ ہو تو بالخصوص اس سے اصلاح و مشاورت کا اہتمام کرنا بھی فائدہ مند ہے۔ ذہن میں یہ بھی آ سکتا ہے کہ اس مذمت کے لیے انسان لوگوں کو دکھا کر کچھ غلط کام بھی کرتا رہے یا اپنے گناہوں کا ذکر لوگوں سے کرتا پھرا کرے۔ یہ دونوں خیال باطل ہیں۔ گناہ کسی بھی نیت سے کرنا جائز نہیں ہے اور گناہ کر کے اس کا چرچا کرنا احادیث کی رو سے بجائے خود ممنوع اور گناہ کا کام ہے۔

## شہرت پسندی

انسان کے لیے فتنوں میں سے ایک فتنہ شہرت بھی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ''بندے کی خرابی کے لیے یہی بہت ہے کہ اس کے دین یا دنیا کی وجہ سے لوگ اس کی طرف انگلیاں اُٹھاتے ہوں' سوائے اس کے کہ جسے اللہ بچا لے۔'' (شعب الایمان) اس کی وجہ سے انسان کے اندر تکبر' عجب اور ریا جیسی برائیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''شہرت کی طلب ہر فساد کی جڑ ہے''۔ ابراہیم بن ادہمؒ فرماتے ہیں: ''جو شہرت کی محبت رکھے گا وہ کبھی بھی اللہ کے ساتھ سچا نہیں ہو سکتا۔'' (الزہد لامام احمد)

بعض اوقات انسان نیکی کے ایسے کام کرتا ہے جو اعلانیہ ہی کرنے کے ہوتے ہیں' مثلاً دعوت و تبلیغ اور جہاد و قتال وغیرہ' اور ان کی وجہ سے انسان کو شہرت بھی ملتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ''بغیر تکلف و خواہش کے اگر شہرت مل رہی ہو تو (ایسا شخص) مذموم نہیں ہے' البتہ فتنے کا اندیشہ ضرور ہے۔ پس شہرت کے مقابلے میں غیر معروف رہنا زیادہ پسندیدہ ہے' لیکن اگر کسی کو دین کی نشر و اشاعت میں اللہ کی طرف سے شہرت مل جائے جبکہ وہ تکلفانہ حاصل کی جائے تو مذموم نہیں ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام' خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم'



ائمہ کرام اور علماء کی شہرت اسی قبیل کی ہے''۔ (احیاء العلوم)

انبیائے کرامؑ، خلفائے راشدینؓ' ائمہ کرام اور علماء کی شہرت کے ساتھ تشبیہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہرت سے بچنے کے لیے اجتماعی کام ترک کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ یہ ان بزرگ ہستیوں کی سنت کے خلاف ہے اور اس میں دین کے مٹ جانے کا اندیشہ بھی ہے۔

## آخرت طلبی

جیسے پہلے بیان ہو چکا کہ ریا کی ایک بڑی وجہ دنیا طلبی ہے تو اس کا علاج و بچاؤ بھی بالکل ظاہر ہے اور وہ ہے آخرت طلبی' کہ انسان کا مطلوب و مقصود آخرت بن جائے۔ انسان آخرت کو اپنا غم بنا دے تو پھر اسے کوئی غم' غم نہیں لگتا' بقول شاعر ؎

زمانے بھر کے غم یا اِک ترا غم
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کا اصل غم آخرت بن جائے تو اللہ اس کے دل کو غنا سے بھر دے گا' اس کے تمام معاملات کو سمیٹ لے گا اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آئے گی۔'' (سنن الترمذی) مشکوٰۃ کی روایت میں الفاظ ہیں: ((مَنْ كَانَتْ نِيَّتُهُ طَلَبَ الْآخِرَةِ)) ''جس کی نیت طلب آخرت بن جائے''۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ آخرت کو اپنا غم بنانے سے مطلب یہ ہے کہ انسان صرف آخرت کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھے اور اسی کی فکر کرے۔

## اخفائے عمل

چونکہ ریاکاری اپنی نیکی اور اچھے اعمال کو دوسروں پر ظاہر کرنے کی خواہش ہی سے شروع ہوتی ہے لہٰذا اس کا ایک علاج یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال میں اِخفاء کا اہتمام کرے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اعمال جن کو باجماعت ادا کرنا لازم نہیں اور پوشیدہ طور پر کیے جا سکتے ہیں انہیں لوگوں سے پوشیدہ رکھ کر ادا کیا جائے۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ ''جمعہ' جہاد' حج وغیرہ جو اعلانیہ اعمال ہیں ان میں اِخفاء نہیں ہو سکتا' پس ان کا اعلانیہ کرنا ہی افضل ہے۔''

امام ابن حجرؒ حدیث مبارکہ ((مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ)) کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اخفائے عمل پر دلالت کرتی ہے۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں: ''ریا سے بچنے کے لیے انسان کو چاہیے کہ وہ خود کو عبادت کے اِخفاء پر عادی بنائے' اپنے عمل کی اطلاع صرف اللہ ہی کو پہنچائے اور اسی پر قناعت کرے اور لوگوں تک اس کی خبر پہنچانے سے خود کو روکے۔ اگرچہ ابتدا میں اس

پر ضرور مشکل ہوتی ہے اور اس طرح سے عمل کرنا انسان پر گراں گزرتا ہے' لیکن اگر انسان بتکلف اس کا اہتمام کرتا رہے تو رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے اس کی عبادت میں حسن اور درستگی پیدا فرما دیتا ہے۔ (ملخصاً از احیاء العلوم)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ اس بندے سے محبت کرتا ہے جو متقی' غنی اور خفی ہو۔'' (صحیح مسلم) 'خفی' کا ایک معنی اعمال میں اِخفاء کرنے والا بھی لیا گیا ہے۔ پوشیدہ عمل کرنے کی فضیلت پر وہ فرمانِ نبویؐ بھی دلالت کرتا ہے جس میں آپ ﷺ نے سات قسم کے لوگوں کو بروز قیامت عرش کے سائے تلے جگہ دیے جانے کا ذکر فرمایا۔ ان میں ایک شخص وہ بھی ہے جو صدقہ اس انداز سے کرتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو پتا نہیں چلتا کہ دائیں نے کیا خرچ کیا ہے۔ (متفق علیہ) سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ مسجد میں سجدے کی حالت میں رو رہا تھا تو آپؓ نے فرمایا: ''اگر تو یہ کام گھر میں کرتا تو بہتر ہوتا۔'' (الزواجر عن اقتراب الکبائر)

## اعلانیہ عمل سے اِخفاء کی طرف جانے کا طریقہ

اگر کسی کو اعلانیہ نفل عبادات میں ریا کا خدشہ ہو' یا وہ تنہائی کی عبادت کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے اخفائے عمل کا اہتمام شروع کرنا چاہے تو اعلانیہ عبادات کی ادائیگی فوراً ترک نہیں کرنی چاہیے بلکہ اعلانیہ عبادات کو جاری رکھتے ہوئے' اس کے متوازی تنہائی کی عبادت شروع کر دینی چاہیے۔ فوری ترک کرنے میں اس بات کا خدشہ ہے کہ تنہائی کی عبادت شروع ہو نہ سکے اور اعلانیہ سے بھی محروم ہو جائے۔ پس کچھ عرصہ دونوں کو ساتھ ساتھ چلایا جائے۔ پھر جب تنہائی میں عبادت کی عادت پڑ جائے تو اعلانیہ نفل عبادت ترک کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اب تنہائی میں ان کا بجالانا شروع ہو چکا ہے جو کہ اصل سنت ہے۔ (ملخصاً از ترک رذائل' ڈاکٹر محمد امین' علامہ احمد جاوید)

## اظہارِ اعمال کا استحباب

اپنی عبادات کو ظاہر کر کے ادا کرنا بعض صورتوں میں مستحب بھی ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کی اقتدا کی جاتی ہے' مثلاً استاد اور مربّی وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے لیے بقدرِ حاجت اعمال کا ظاہر کرنا مستحب ہے جبکہ ان کی نیت یہ ہو کہ لوگ ان کی پیروی میں یہ عمل کریں گے۔ نبی اکرم ﷺ کی سنت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی منقول ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور سلف میں سے بعض لوگ نماز تہجد مسجد میں پڑھا کرتے تھے تاکہ لوگ اس نیکی میں ان کی



پیروی کریں۔ پس اہلِ علم ایسا کر سکتے ہیں جبکہ وہ اس کے تقاضوں سے واقف ہوں اور شیطان کے حملوں کے مقابلے میں بیدار اور اپنے عمل اور نیت کی درستی کا اہتمام کر رہے ہوں۔ اور جس کی صورتِ حال اس کے برعکس ہو اس کے لیے اِخفاء ہی افضل ہے اور سلف کی اکثریت کا اسی پر عمل ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو بلند قرآن پڑھتے دیکھا تو اس کی تحسین فرمائی' جبکہ ایک دوسرے شخص کو روک دیا اور فرمایا: ''مجھے مت سناؤ بلکہ اللہ کو سناؤ۔'' (ملخص از فتح الباری) امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اگر انسان کو ریا کا خدشہ ہو تو پھر لوگوں کی ترغیب کے لیے بھی اعمال کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں اس کا اپنا عمل ہی ضائع ہو جانے کا خدشہ ہے''۔ (احیاء العلوم)

نیز امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ ''نیکیوں کے اس اظہار کا استحباب اسی کے لیے ہے جو اس رتبے پر ہو کہ اس کی اقتدا کی جا سکے' رہا ایک عام شخص جس کی پیروی و اقتدا نہیں کی جاتی اسے خود کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہیے بلکہ اس کے لیے اِخفاء ہی بہتر ہے۔'' (احیاء العلوم)

## اِخفاء کے باوجود تعریف

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کوئی نیکی کا کام اپنی طرف سے چھپا کر کر رہا ہوتا ہے' لیکن کسی نے اسے دیکھ لیا ہے اور اس دیکھنے پر اس نے خوشی محسوس کی تو یہ خوش ہونا ریا میں شامل نہیں ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: ''اے اللہ کے رسول! کبھی انسان کوئی عمل کرتا ہے اور اسے دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس دوران کوئی شخص اس کے پاس آ جاتا ہے تو چھپا کر عمل کرنے والے کو اپنے اس حال میں دیکھے جانے پر خوشی محسوس ہوتی ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے لیے دہرا اجر ہے' ایک تو تنہائی میں عمل کرنے کا اور دوسرا اعلانیہ عمل کرنے کا۔'' اعلانیہ عمل میں دیکھنے والوں کے لیے ایک ترغیب بھی موجود ہوتی ہے' لہٰذا آپ ﷺ نے اس امکان کی طرف اشارہ فرما دیا کہ اگرچہ تم اپنی طرف سے چھپا رہے تھے لیکن اللہ نے ظاہر کر دیا تو اب وہ اجر بھی تمہیں ملنے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ (مرقاۃ) ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ''جسے اس کی نیکی پر خوشی اور برائی پر ندامت ہو تو وہ مؤمن ہے''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی پر خوش ہونا ایمان کی نشانی ہے۔ البتہ خوش ہونے کا یہ عمل وہ ہے جس کی بنیاد صرف خدا خوفی پر ہی ہے اور لوگوں کو دکھانا اصلاً مطلوب نہیں ہے' اور اس میں بھی اصل خوشی اللہ کی توفیق اور فضل پر ہونی چاہیے نہ کہ اپنی کمائی پر' جیسا کہ ابن رجب لکھتے

ہیں: ''جب انسان کوئی عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کر رہا ہو' پھر اللہ تعالیٰ دوسرے اہلِ ایمان کے دل میں اس کے لیے تعریف کے جذبات پیدا کر دے تو اس پر وہ اللہ کی رحمت اور فضل پر خوش ہو تو یہ خوشی اس کے لیے نقصان دہ نہیں ہے۔'' (جامع العلوم والحکم)

## ایک وسوسہ

بعض اوقات انسان نیکی کا کوئی کام کرتا ہے تو اسے خیال آتا ہے کہ شاید وہ ریا میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس طرح نہ صرف عبادت کا خشوع وخضوع رخصت ہو جاتا ہے بلکہ انسان عبادت ہی ترک کرنے پر آ جاتا ہے۔ اعتقادی ریا کار یعنی جس کی عبادت کا باعث اصلی دکھاوا اور ریا ہوتا ہے انہیں یہ وسوسہ لاحق نہیں ہوتا' بلکہ مخلص اہلِ ایمان ہی کو لاحق ہوتا ہے۔ اسے بالکل امام حسن بصریؒ کے اس قول پر قیاس کرنا چاہیے جو انہوں نے نفاق کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ''اس سے وہی ڈرتا ہے جو مؤمن ہوتا ہے اور اس سے وہی بے خوف ہوتا ہے جو منافق ہوتا ہے''۔ (صحیح البخاری) پس جب انسان کو ریا کے بارے میں وسوسے ستا رہے ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ریا پر راضی نہیں ہے بلکہ اسے ناپسند کر رہا ہے۔ اس صورت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کچھ لوگوں کا یہ واقعہ ذہن میں رہنا چاہیے۔ انہوں نے عرض کیا تھا کہ ہمیں ایسے خیالات آتے ہیں جن کے مطابق قول یا فعل انجام دینا ہمیں بہت بھاری محسوس ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو عین ایمان ہے''۔ (صحیح مسلم)

اس وسوسے کی حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کو نیکی سے ہٹانے میں بہت ہی مستعد رہتا ہے' کیونکہ وہ ہمارا حقیقی اور ازلی و مستقل دشمن ہے۔ چنانچہ اول تو وہ انسان کو کفر یا پھر گناہ کے کام پر لگانا چاہتا ہے۔ کوئی انسان اس سے بچ جائے تو اسے نیکی کے کام سے روکتا ہے' اور اس پر بھی کامیابی نہ ملے تو وہ انسان کی نیت میں فساد برپا کر کے اس کے اعمال کو ضائع کروانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں بھی اگر کامیابی نہ ملے تو وہ انسان کو اعمال سے روکنے کے لیے اس کے دل میں ریا اور دکھلاوے کا خوف پیدا کر کے اسے عمل سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا ریا کے اندیشے پر بھی عبادت ترک نہ کرنی چاہیے۔ اگر صرف ریا کے اندیشے پر عبادت ترک کی جانے لگے تو پھر انسان نیکی کا کوئی بھی کام نہ کر سکے۔ کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ لوگ مجھے عبادت کرتے دیکھ کر ریا کار نہ سمجھیں' یہ بھی ایک خام خیال ہے۔ ہم دوسروں کے خیالات کے مکلّف نہیں ہیں۔ فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ ''لوگوں کی وجہ سے عمل ترک کرنا بھی ایک قسم



کی ریا ہے''۔ (اخلاص والنیة)

ان کے اس قول کی توجیہ یہ ہے کہ ریا میں لوگوں کی تعریف کے حصول کے لیے عبادت کی جاتی ہے اور اس طرزِ عمل میں لوگوں کی مذمت یا ریا کار سمجھنے کی وجہ سے ترکِ عمل ہے' لہٰذا دونوں میں اصل کے حوالے سے جذبہ محرکہ لوگوں کی پسند و ناپسند ہی ہے۔ پس انسان کو چاہیے کہ اس وسوسے کے باوجود اپنی عبادت یا نیک کام ترک نہ کرے' بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا طالب اور اس سے دعا مانگتے اور وساوس کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی عبادت کو جاری رکھے۔

## احسان

ہم یہ جان چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے حسن عمل کا مطالبہ کیا ہے اور حسن عمل میں اخلاص اور ریا سے بچنا بھی شامل ہے۔ پس ریا کا ایک علاج اور اس سے بچنے کا ایک ذریعہ احسان بھی ہے جو کہ حدیثِ جبریلؑ میں بیان ہوا ہے۔ جب نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''تم اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو' اور اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔'' (صحیح مسلم) حدیثِ جبریلؑ میں بیان کردہ احسان کے دو مطلب بیان کیے گئے ہیں: ایک تو حسنِ نیت اور دوسرا حسنِ عمل۔ ملا علی قاریؒ حدیثِ جبریلؑ کی شرح میں یہ دونوں مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ بھی کہا گیا کہ احسان سے مراد اخلاص ہے۔ جیسا کہ ''النہائیہ'' (فی غریب الاثر لابن اثیر الجزری) میں ہے۔ کیونکہ اخلاص' اسلام و ایمان اور اعمال سب کی صحت کی شرط ہے۔ اگر کوئی زبان سے کلمہ تو پڑھ لے لیکن اس میں اخلاص شامل نہ ہو تو اس کا ایمان ہی صحیح نہیں ہے یا اسی طرح اگر کوئی عمل کرے لیکن اس کا عمل اخلاصِ نیت سے خالی ہو تو یہ عمل بھی ناقابل قبول ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اخلاص کا مظاہرہ کرنے والا ہی اپنے عمل کا اجر خود کو پہنچاتا ہے اور ریا کار اپنے عمل کو خود ہی باطل کر دیتا ہے۔ احسان کا ایک زیادہ واضح معنی احکامِ اسلام پر اچھی طرح عمل کرنا بھی ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے بھی اخلاص نیت احسان میں داخل ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ احسان میں اللہ کے ساتھ ایک حضوری' اور اللہ کے علاوہ ہر کسی کے خیال کی نفی بھی موجود ہے۔'' (مرقاۃ)

پس انسان کو اللہ کی عبادت اور اطاعت کے دوسرے کاموں میں اللہ کو مستحضر رکھنا چاہیے

اور یہ خیال رکھنا چاہیے کہ میں گویا اللہ کو دیکھ رہا ہوں یا دوسرے درجے میں یہ یقین رکھے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ جیسے نبی اکرم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے سورۃ الشعراء میں رب العالمین نے فرمایا: ﴿الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۲۲۰﴾﴾ ''وہ ذات جو آپ کو دیکھتی ہے جب آپ (تہجد کے وقت) کھڑے ہوتے ہیں اور جب آپ نمازیوں کے درمیان پھرتے ہیں اور وہ سب کچھ سننے والا' جاننے والا ہے''۔ اور سورۃ الطّور میں فرمایا: ﴿فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا﴾ (آیت ۴۸) ''پس آپ ہماری نگاہوں میں ہیں''۔ اس طرح کی آیات پر غور وفکر کر کے انسان یہ احساس پیدا کر سکتا ہے کہ میں اللہ کی نگاہ میں ہوں''۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہوں، وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس احساس کے تحت انسان ریا سے محفوظ رہ سکتا ہے' کیونکہ رِیا میں مخلوق کو دکھانا مطلوب ہوتا ہے۔ جس قدر اللہ کی حضوری یا معیت کا احساس گہرا ہوتا جائے گا اسی قدر مخلوق کا دیکھنا اور ان کی معیت کا احساس جاتا رہے گا۔ بلاتشبیہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسے سورج کے سامنے کسی بڑی سے بڑی لائیٹ کی روشنی بھی ماند پڑ جاتی ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کے استحضار و احساسِ معیت کے سامنے مخلوق' اس کے دیکھنے اور دکھانے کی خواہش ختم ہو کر رہ جائے گی۔ امام احمد بن حنبلؒ نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے: ''جب بھی عمل کرو لوگوں کو احاطہ قلب سے نکال باہر کرو اور اپنے قلب کو ہر وقت اللہ کے لیے جھاڑ پونچھ کر رکھو۔'' (ایمان کا سبق' حامد کمال الدین)

## خلوت وجلوت کے تضاد کو ختم کرنا

بعض دفعہ انسان لوگوں کے سامنے تو اللہ کی نافرمانی سے بچنے کا اہتمام کرتا ہے لیکن تنہائی میں جا کر وہ اس کے برعکس رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ گویا تقویٰ کوئی اوور کوٹ تھا جو گھر جا کر اتار دیا گیا۔ انسان کو اللہ کی خشیت کا مظاہرہ ہر حال میں کرنا چاہیے' چاہے لوگوں کے سامنے ہو یا تنہائی میں۔ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ((اتَّقِ اللّٰهَ حَیْثُمَا كُنْتَ) (سنن الترمذی) ''اللہ سے ڈرتے رہو چاہے تم جس جگہ بھی ہو''۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک دعا کے الفاظ بھی یہ ہیں: ((اَسْاَلُكَ خَشْیَتَكَ فِی الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ)) (سنن النسائی) ''اے اللہ! میں تجھ سے تیرا خوف مانگتا ہوں لوگوں سے غیوبت کے حال میں بھی اور لوگوں کے سامنے بھی''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مطلوب صفت ہے اور اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ مشکوٰۃ شریف کی ایک روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ''مجھے



میرے پروردگار نے نو چیزوں کا حکم دیا ہے.....'' ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: ''میں خلوت و جلوت ہر حال میں اللہ کی خشیت اختیار کروں۔''

شعب الایمان کی ایک حدیث کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے باعثِ نجات چیزوں میں سے ایک یہ بھی بیان فرمائی کہ ((خَشْیَةُ اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ)) ''اللہ کی خشیت خلوت میں بھی ہو اور جلوت میں بھی''۔ پس یہ صفت انسان کو نجات دلانے والی ہے۔ اور معاملہ اگر اس کے برعکس ہو تو یہ باعث ہلاکت ہے' اور یہ بھی کہ ایسا طرزِ عمل خدا خوفی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ امام شوکانیؒ فرماتے ہیں: ''تنہائی میں اللہ کی خشیت نہ ہو بلکہ لوگوں ہی کے سامنے خدا خوفی کا مظاہرہ ہو تو یہ خدا خوفی نہیں بلکہ یہ لوگوں ہی کی خشیت ہے''۔ (مرعاۃ المفاتیح)

خلوت وجلوت کا یہ تضاد غیر شعوری طور پر ہی پروان چڑھتا ہے' لیکن رفتہ رفتہ انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے اور لوگوں کے سامنے تو اللہ کی اطاعت میں لگا رہتا ہے اور خود کو باور یہ کراتا ہے کہ یہ میں اللہ کے تقویٰ کی وجہ سے کر رہا ہوں' لیکن جوں ہی تنہائی میسر آتی ہے وہ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ یہیں سے ریاکاری کی ابتدا ہوتی ہے اور انسان ایک پختہ ریاکار بن جاتا ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جس کا ظاہر اس کے باطن سے زیادہ عمدہ ہے اس کا میزانِ عمل قیامت کے دن ہلکا پڑے گا اور جس کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ اچھا ہے قیامت کے دن اس کا میزانِ عمل بھاری پڑے گا''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تنہائی کی عبادت میں اخلاص کی امید زیادہ ہے اور اعلانیہ عبادت میں اخلاص کی امید قدرے کم ہے اور ریا کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ پس جس کے نامہ اعمال میں تنہائی کی عبادت زیادہ ہے اسے اجر بھی زیادہ ملے گا اور جس کی عبادت میں اعلانیہ کا تناسب زیادہ ہے اسی قدر اس کے اعمال کا وزن بھی کم پڑنے کا اندیشہ ہے۔

زبید بن حارث الایامیؒ فرماتے ہیں: ''جس کی تنہائی اس کی اعلانیہ زندگی سے بہتر ہوگی یہ اس کے لیے باعث فضیلت ہے۔ اور جس کے پوشیدہ معاملات اس کے ظاہری معاملات کے برابر ہی ہوں گے تو یہ تو برابر سرابر کی بات ہے۔ اور جس کا باطن اس کے ظاہر کے مقابلے میں ہلکا ہوگا تو یہ ظلم وزیادتی ہے''۔ (الاخلاص والنیۃ، لابن ابی الدنیا)

اس قول میں ہمارے سامنے تین معیار آ گئے۔ ان میں سے آخری یعنی انسان کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ نیکی پر مشتمل ہو' یہ ایک بہترین صورت ہے اس میں ریا اور دکھلاوے کا امکان کم اور اخلاص کی توقع زیادہ ہے۔ ہمیں اسی کی کوشش کرنا چاہیے۔

انسان جس چیز کو باعث نقصان و تکلیف باور کر لے اس سے دور بھاگتا ہے۔ پس اگر ہم پر ریا کا نقصان دہ اور مضر و قبیح ہونا واضح ہو جائے تو اس سے بچنا بھی ہمارے لیے آسان ہوگا۔ ریا کاری کے بارے میں یہ جذبات پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ریا کی مذمت و قباحت‘ اس کی مختلف سزاؤں‘ مثلاً دنیا و آخرت کی رسوائی‘ حبطِ اعمال‘ دوزخ کی سزا وغیرہ سے واقفیت حاصل کرے۔ ان مضامین پر مشتمل آیات‘ احادیث و آثار اور دیگر کتب کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔ ان سزاؤں کا مراقبہ کیا جائے جو احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم کی وہ روایت جس میں ریا کار مجاہد‘ سخی اور عالم کو دوزخ میں ڈالے جانے کا ذکر ہے‘ پڑھ کر انسان یہ تصور کرے کہ اس کی جگہ اگر میرا یہ انجام ہو تو میری حالت کیسی ہو۔ یا پھر انسان چشم تصور سے یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ میدانِ حشر میں اچانک میری ساری نیکیاں باطل قرار دے دی گئیں‘ یا پھر ”جُبُّ الْحُزن“ کو تصور میں لانے کی کوشش کرنا‘ وغیرہ۔

## وردِ آیاتِ کریمہ

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ طرزِ عمل معلوم ہوتا ہے کہ آپ بعض اوقات کسی آیت کو بار بار دہراتے رہتے تھے۔ قرآن پاک کی سمجھ و تاثیر میں اضافے کے لیے یہ طریقہ بہت ہی فائدہ مند ہے۔ اس طریقہ کو مختلف برائیوں سے نجات پانے کے لیے آزمایا گیا تو بہت مفید پایا گیا۔ کویت کی مدرّسۂ قرآن محترمہ سمیہ رمضان نے اپنی کتاب ”قرآن پر عمل“ میں اس طریقے کے استعمال اور اپنے حیرت انگیز خوشگوار تجربات نقل کیے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی تلمیذات خواتین کو پہلے تو کسی برائی کے بارے میں وارد شدہ آیات کا مطلب و مفہوم اچھی طرح سمجھاتی ہیں اور پھر ان سے کہتی ہیں کہ اب چلتے پھرتے اس آیت کو دہراتی رہیں۔ بار بار کی اس دہرائی سے وہ آیت اور اس کے مطلب و مفہوم اور تاثیر ان کے دل و دماغ میں ثبت ہو جاتی ہے اور اس سے ان کے اندر ایک ایسی صلاحیت و ملکہ یا اس برائی کے خلاف ایک خاص قسم کی قوتِ مدافعت پیدا ہو جاتی ہے جو انہیں اس برائی سے بچاتی ہے۔ یہ طریقہ ہر عیب سے اصلاح کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے اولاً تو متعلقہ آیات کا اچھی طرح فہم حاصل کرنا چاہیے جو کسی بھی تفسیر کے مطالعے یا درس کی سماعت سے حاصل کیا جا سکتا ہے‘ پھر ان میں سے ایک یا چند آیات منتخب کر کے ان کا ورد جاری رکھا



جائے۔ ریا کے حوالے سے درج ذیل آیات کا فہم و ورد مناسب ہوگا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی ۙ کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَکَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾﴾ (البقرۃ)

”مؤمنو! اپنے صدقات (و خیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ پس اس (کے مال) کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے۔ (اسی طرح) یہ (ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

﴿وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ یَّکُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا ﴿۳۸﴾﴾ (النساء)

”اور خرچ بھی کریں تو (اللہ کے لیے نہیں بلکہ) لوگوں کے دکھانے کو‘ اور ایمان نہ اللہ پر لائیں نہ روزِ آخرت پر۔ (ایسے لوگوں کا ساتھی شیطان ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہوا تو (کچھ شک نہیں کہ) وہ برا ساتھی ہے۔“

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوةِ قَامُوْا کُسَالٰی ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۴۲﴾﴾ (النساء)

”منافق (ان چالوں سے اپنے نزدیک) اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور (یہ اس کو کیا دھوکہ دیں گے) وہ انہیں دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔ اور جب یہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر (صرف) لوگوں کو دکھانے کو اور اللہ کو یاد ہی نہیں کرتے مگر بہت کم۔“

﴿وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۴۷﴾﴾ (الانفال)

”اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو اتراتے ہوئے (یعنی حق کا مقابلہ کرنے کے لیے) اور لوگوں کو دکھانے کے لیے گھروں سے نکل آئے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

اور جو اعمال یہ کرتے ہیں اللہ ان پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝٧﴾ (الماعون)

''تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے' جو اپنی نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں' جو ریا کاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں وقتی استعمال کے لیے نہیں دیتے۔''

## دعا کی ضرورت

اخلاص سمیت ہر نیکی اور خوبی کی توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے' لہٰذا اپنی طرف سے کوشش کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی ضروری ہے کہ اللہ ہمیں اخلاصِ نیت کی توفیق دے اور اس کے منافی طرزِ عمل سے بچائے۔ نبی اکرم ﷺ ریا سے حفاظت کی دعائیں مانگا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ سے ہزار گنا زیادہ ان دعاؤں کے محتاج ہیں۔ آپ ﷺ کی دو دعائیں درج ذیل ہیں' جن کا پڑھنا ہمارے لیے بہت مفید ہوگا۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ السُّمْعَةِ وَالرِّيَاءِ (مستدرك حاكم)

''اے اللہ! میں شہرت پسندی اور ریا کاری سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔''

اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ' وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّيَاءِ' وَلِسَانِیْ مِنَ الْكَذِبِ' وَعَيْنِیْ مِنَ الْخِيَانَةِ' فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (نوادر الاصول للحکیم الترمذی)

''اے اللہ میرے دل کو نفاق سے' میرے عمل کو ریا سے' میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھوں کو خیانت سے پاک کر دے۔ بے شک تو آنکھوں کی خیانت اور دل میں چھپے خیالات کو جاننے والا ہے۔''


جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

# ''کتنا بدل گیا ہے تری انجمن کا رنگ!''

عدیل احمد آزاد☆

پچھلے دنوں ہم ماڈل ٹاؤن لاہور کے ایک بڑے سٹور میں موجود تھے' کاؤنٹر پر ایک خاتون اور ایک سات آٹھ سال کا بچہ بھی کھڑے تھے' بچہ کسی چیز کی ضد کر رہا تھا اور خاتون ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ مجھے جس بات نے حیران کیا وہ یہ تھی کہ خاتون جب دکاندار سے بات کرتی تو اردو بولتی اور جب اپنے بیٹے کو مخاطب کرتی تو انگریزی میں بات کرتی۔ اتنے میں اُس کا خاوند بھی آ گیا اور آتے ہی بیوی کو ڈانٹنے لگا' بچے کی طرف اشارہ کر کے بولا: ''کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ اِسے عام لوگوں میں مت لایا کرو' اِس کے سامنے انگلش کے علاوہ دوسری کوئی زبان مت بولا کرو' اس سے بچے کی تعلیم و تربیت پر برا اثر پڑتا ہے'' وغیرہ۔

مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ اردو بولنے اور سننے سے بچے کی تربیت اور تعلیم پر برا اثر پڑتا ہے۔ آغا شورش کاشمیری نے کہا تھا: ''اردو میں کائنات سما جانے کا حوصلہ ہے''۔ اس میں دو آراء نہیں ہو سکتیں کہ اردو زبان و ادب نے ایسے ایسے ہیرے تراشے ہیں جن سے علوم و فنون کی پیشانی ہمیشہ دمکتی رہے گی اور تاریخ انسانی ان کے گن گاتی رہے گی۔ بقول انور مسعود ع ''تو کی جانیں بھولیے مجھے انارکلی دیاں شاناں!'' (بھولی بھینس تجھے کیا معلوم انارکلی کی شان و شوکت کیا ہے!).....بھینس اگر سوچ سکتی تو رونا کس بات کا تھا؟

بچے والدین کے لیے فطرت اور قدرت کا سب سے بڑا انعام ہیں۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں بہت تمنائیں وابستہ رکھتے ہیں۔ اولاد اگر علم کے زیور سے آراستہ ہو تو ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دلوں کا سرور بن جاتی ہے۔ دنیا کے ہر مذہب اور معاشرے میں بچوں کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کا بڑا قوی احساس پایا جاتا ہے' جبکہ اسلام اسے فرضیت کے درجے میں شمار کرتا ہے۔ کیونکہ اولاد اگر علم و آگہی سے

☆ گولڈ میڈلسٹ' اسلامیہ یونیورسٹی' بہاول پور adeelahmedrai99@gmail.com



محروم رہ جائے تو والدین کے لیے جیتے جی مستقل عذاب بن جاتی ہے۔

اسلام ماں کی گود سے قبر کے گڑھے تک (مِن المَهد الی اللَّحد) مکمل دستورِ تربیت فراہم کرتا ہے' جس میں بچوں کی کردار سازی ایک خاص مفہوم رکھتی ہے۔ یہ منہج اور ضابطہ دیگر ادیان و مذاہب سے بالکل جُداگانہ ہے۔ سورۃ التحریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (آیت:٦)

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے بیوی بچوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں.....''

آتشِ جہنم سے بچاؤ تب ہی ممکن ہو سکے گا جب نسلِ نو کی تعلیم و تربیت میں صحیح اسلامی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔ بچے کی کردار سازی میں مرکزی کردار ماں باپ کا ہوتا ہے۔ بچے ماں باپ کی خوشیوں' شادمانیوں اور مسرتوں بھرے گلشن کے پھول ہوتے ہیں' لہلہاتے' مسکراتے' گنگناتے' چہچہاتے' شاداب غنچے ہوتے ہیں۔ ان کی آبیاری اور ہمہ وقت آبادکاری' نگرانی اور ہمہ جہت باغبانی کرنا والدین کا فرضِ منصبی ہے۔ بالکل ایسے جیسے ایک باغبان باغ کے پیڑوں' پودوں اور پھولوں کی دیکھ بھال کرتا ہے' ان کی نزاکت و رعنائی' زیبائش و دلربائی کو بچانے کے لیے ہر جتن کرتا ہے۔ بلکہ ایک سچا مسلمان اس سے بڑھ کر اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہے تاکہ وہ دنیا میں بھی کامیاب مسلمان بن کر جی سکیں اور آخرت میں بھی اجرِ عظیم کے حق دار ٹھہریں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ ..... وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْؤُوْلٌ عَنْهُمْ)) (متفق علیہ)

''تم سب کے سب راعی (ذمہ دار) ہو اور تم سب سے تمہاری رعیّت کے بارے میں پوچھا جائے گا.....اور ہر مرد اپنے بیوی بچوں کا ذمہ دار ہے اور اس سے ان کے متعلق سوال کیا جائے گا۔''

نیک' صالح اور پاک دامن معاشرے کا قیام شریعتِ مطہرہ کا اہم ترین مقصد ہے۔ جہاں شریعت نے تقویٰ' طہارت' عمدہ اخلاق' ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی' اور فکرِ آخرت جیسے امور کی جانب متوجہ فرمایا وہاں صحیح اور اسلامی اصولوں کے مطابق تربیتِ اولاد کو بھی لازمی امر قرار دیا ہے۔ اولاد انسان کا اصل سرمایہ ہے' جس کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ روحانی تربیت بھی ضروری ہے۔ روحانی تربیت ہی انسان کی اصل فضیلت ہے' ورنہ جسمانی اعتبار سے

تو جانور بھی اپنے بچے پال ہی لیتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں پوری دنیا کا میڈیا اور دیگر ادارے اس تگ وتاب میں لگے ہوئے ہیں کہ جیسے بھی ممکن ہو مسلمانوں کو اپنا ذہنی غلام بنایا جائے اور ان کی نئی نسل کو اپنے کلچر میں مکمل طور پر رنگ لیا جائے۔ ان کے قلوب واَذہان سے مسلمانیت کے نقوش حرفِ غلط کی طرح مٹا دیے جائیں اور ان سے ان کا تشخص چھین کر درمیانی سی کوئی ایسی مخلوق بنا دیا جائے جسے اپنے قبول کریں نہ بیگانے۔ ٹی وی' ڈش' لیپ ٹاپ' انٹرنیٹ' کیبل نیٹ ورک سسٹم اور انگلش میڈیم سکولز کے ذریعے مسلم نما صلیبی تیار کیے جائیں جو نہ اِس ہوں نہ کوّے۔

اس سلسلے میں انگلش میڈیم سکولز تباہ کن ہتھیار کے طور پہ ذمہ داری نباہ رہے ہیں' جو قائم تو اکثر مسلمانوں نے کیے ہوتے ہیں مگر ان کی ذہن سازی میں صلیبی درندوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کی آڑ میں انگریزی ثقافت پرورش پا رہی ہوتی ہے۔ ان سکولوں کا جال پوری دنیا میں بالعموم اور اسلامی ممالک میں بالخصوص پھیلا ہوا ہے۔ یہ سکولز آج کل سب سے زیادہ مسلمان بچوں کو متاثر کر رہے ہیں۔ یہ انگریزی زبان کی ثقافت ہے کہ بچہ گھر آ کے انگریزی زبان کے ایک دو ٹوٹے پھوٹے الفاظ بول دے' ماما' پاپا' انکل' ڈیڈی' آنٹی' وغیرہ تو ماں باپ خوشی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ یہی بچہ جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو اسے گھر کا خیال ہوتا ہے نہ والدین کی فکر' اس کے دل ودماغ پر رومانس کا خمار اور بخار چھایا ہوتا ہے۔

اسلامی ماحول سے نکال کر جس چاؤ اور چاہت کے ساتھ بچوں کو انگلش سکولز اور اس طرح کے دیگر اداروں میں دھکیل دیا جاتا ہے وہ ماں باپ کے لیے نام نہاد معاشرتی افتخار تو بن جاتا ہے مگر انہیں سچی تہذیب اور اسلامی اقدار سے بڑی حد تک محروم کر دیتا ہے۔ بچپن کی تعلیم بڑھاپے تک اثر انداز ہوتی ہے۔ وقت گزرتا ہے' بچے بڑے ہوتے ہیں' والدین بڑھاپے کو پہنچ جاتے ہیں۔ پھر وہی بچے جنہیں والدین نے بڑے پیار سے انگریزی تہذیب وتعلیم سے آراستہ کیا تھا' ان والدین کو اٹھا کر ''اولڈ ہومز'' میں پھینک دیتے ہیں' جہاں وہ اپنی موت کو بھی ترستے رہتے ہیں۔ مرجانا بہت آسان ہے' مگر باوقار طریقے سے زندہ رہنا ذرا مشکل کام ہے' اور یہی اصل چیلنج بھی ہے۔ ؎

موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو  پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے!

(احمد ندیم قاسمی)



ماں کی آغوش بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے مگر آج کل کی ماؤں کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ اپنے بچوں کو پیار بھری نگاہ سے دیکھ بھی لیں۔ اس صنعتی اور روشن خیال دَور کی چکا چوند نے بچے سے ماں کی گود چھین لی ہے۔ آج کی ماں کو دفتر' پارٹیز اور فنکشنز سے وقت ہی نہیں ملتا۔ ان کی اسی ضرورت نے ''ڈے کیئر سینٹرز'' کو رواج دے رکھا ہے' جہاں انہیں ماں کی قربت سے جدا کر کے دوسری خواتین کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو لاکھ کوشش کے باوجود بھی ممتا کا متبادل فراہم نہیں کر سکتیں۔

والد کا کردار اور توجہ بھی بچے کی بنیادی ضرورت اور اساسی حق ہے۔ کاروباری مصروفیات' بزنس میٹنگز اور دیگر مشاغل سے جان چھوٹے تو فرزند پر بھی نظرِ التفات ہو۔ پدرانہ شفقت کے ساتھ ساتھ بچے کے روز وشب سے آگاہی اور مناسب اصلاح والد کا فرضِ منصبی ہے' جس سے اغماض بچے کا مستقبل تاریک کر دیتا ہے اور باپ کی خوشیاں چھین لیتا ہے۔ تب وقت اور اختیار دونوں بے مروّت ہو چکے ہوتے ہیں۔ بچپن میں والد کا ڈر خدا کے خوف سے زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔ احساس نابالغ اور جہالت ہم رکاب ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ اعضاء بھی نمو پاتے ہیں اور جہالت بھی جوان ہوتی ہے۔ فکر آوارہ اور خیالات گدلے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر انگلش میڈیم سکولز' اے لیول' او لیول کا نصاب۔ نونہال بچے اور جدید الحادی کلچر کا تیزاب۔ دنیا بھی تباہ اور آخرت بھی برباد۔ (خَسِرَ الدُّنْیَا وَالآخِرَۃ)

مادر پدر آزاد' اس نیو جنریشن نے جہاں اسلامی اقدار کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے وہاں اخلاقی اعتبار سے بھی معاشرے کو مغرب زدہ کر کے رکھ دیا ہے' جس کا مشاہدہ ہم اپنی ہر گلی' محلے' گاؤں اور شہر میں کر سکتے ہیں۔ نوجوان ڈھیلی شرٹیں اور گھٹنوں تک بے ڈھنگے نیکر پہن کر پھرتے ہیں۔ رات ڈیڑھ دو بجے تک فلمیں دیکھتے ہیں۔ میوزک سنتے اور تاش کھیلتے ہیں۔ دن گیارہ بجے تک بستر پر پڑے رہتے ہیں۔ انگریزی رسالے اور بداخلاقی پر مبنی کتابیں پڑھتے ہیں۔ برگر کھاتے ہیں اور چیری کی باتیں کرتے ہیں۔ فرینکفرٹ' پیرس' لندن' واشنگٹن اور نیویارک کا ذکر ایسے کرتے ہیں جیسے وہاں سب کی نانی اماں کا گھر ہے۔ باقاعدہ ''ویک اینڈ'' مناتے ہیں۔ ''کرسمس ڈے'' کے پروگرام میں جاتے ہیں۔ ''اپریل فول'' کو عبادت سمجھتے ہیں۔ القصہ! مغربی نظامِ تعلیم سے مرعوب' یورپی ثقافت کے دلدادہ نوجوان اپنا دینی' اخلاقی اور علاقائی تشخص کھو چکے ہیں۔ آج کے نوجوان کو دولت' عورت' شہرت' شہوت اور شراب کی

''لَت'' لگ چکی ہے۔ جوانی کے جوش میں لاکھوں گناہوں کا ارتکاب کرنے والا جوانِ رعنا بھول بیٹھا ہے کہ خدا کو منانے کی عمر ہی جوانی کی ہے۔

انگریزی سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اعلیٰ ڈگریاں تو حاصل کر لیں لیکن دین وایمان کے بارے میں ذرا بھی نہ سوچا۔ عارضی اور فانی زندگی اُخروی اور ابدی حیات پر فوقیت پا گئی۔ افکار اور خیالات بدنی راحت کے اسباب تلاش کرنے لگے۔ جہود ومساعی ظاہری بود وباش تک محدود ہو گئیں۔ چہرے نکھرتے گئے اور دل ویران ہوتے گئے۔ لباس چُست اور کردار سست پڑ گئے۔ ہم آخر منتظر کس کے ہیں؟ ورودِ عزرائیل کے یا صورِ اسرافیل کے؟؟؟

جب آنکھیں نفس کی پسندیدہ چیزیں دیکھنے لگیں تو دل انجام سے اندھا ہو جاتا ہے اور نتیجہ وہی ''آدھے تیتر آدھے بٹیر''۔ زندگی بھر اسلام سے شرماتے رہے' جبکہ آخری رسومات مکمل ''فاتحہ خوانی'' کے ساتھ۔ حقائق سے آنکھیں چرانا تاریکی ہے اور تاریکی میں زندگی گزارنا ہلاکت ہے۔ آخر کب تک جینا ہے؟ بمشکل ساٹھ' ستر برس۔ اور پھر ہاتھوں سے لگائی ہوئی گرہیں دانتوں سے بھی نہیں کھلیں گی۔

مغرب کی چکا چوند روشنیوں نے ہماری نوجوان نسل کو ایسے طریق سے اپنا حواری بنایا ہے کہ ''گھر کا چھوڑا نہ گھاٹ کا''۔ آج کا نوجوان سمجھتا ہے عروج وکمال اور رفعت وجمال کی جتنی بھی دلکش اور مہذب راہیں ہیں ان کا منبع ومرکز محض یورپی اور مغربی تہذیب ہے۔ اسی تہذیب وثقافت کا تربیت یافتہ نوجوان باپ کو ''ڈیڈی'' اور ماں کو ''ممّی'' کہتا ہے۔ روپے اور دینار کو پونڈ اور ڈالر کے سامنے کھڑا کر کے دیکھتا ہے۔ چرچل' ہٹلر' نپولین اور جارج کو لیڈر مانتا ہے۔ رسل' برناڈ شا' کیٹس' کالرج اور نطشے کو ''فیورٹ'' شاعر تسلیم کرتا ہے۔ جیکسن' راجر مور' آرنلڈ' سٹون' میڈونا اور وینڈیم کو ہیرو قرار دیتا ہے۔ یہ ''پائن ایپل'' کھاتا ہے ''سلائس'' کا ناشتہ کرتا ہے' دن کو ''لنچ'' اور رات کو ''ڈنر'' کرتا ہے۔ شیمپین اور ''جانی واکر'' کا ذکرِ خیر کرتا ہے۔ ''کافی'' لیتا ہے اور ''سوپ'' پیتا ہے۔ اسے پریشانی نہیں ''ڈپریشن'' ہوتی ہے۔ درد نہیں ''پین'' ہوتا ہے۔ رب نہیں ''گاڈ'' یاد آتا ہے۔ یہ خوش نہیں ہوتا ''انجوائے'' کرتا ہے۔ اسے دُکھ نہیں ''اوٗنو'' ہوتا ہے۔ یہ سلام نہیں ''ہائے'' کرتا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ صلاح الدین ایوبیؒ کون تھا' طارقؒ بن زیاد کن کا ہیرو ہے' شاہ اسماعیلؒ اور سید احمدؒ کن بھلے مانسوں کا نام ہے۔ محمد علی جوہر اور ظفر علی خان کس مٹی اور وطن کی آبرو تھے؟ اک فقط محمد علی جناح اور جنابِ اقبال



سے رسم وراہ۔ وہ بھی خیالی سی' بے ربط سی' بدمزہ سی۔ ''سطحی محبت عدمِ محبت سے زیادہ مضر ہوتی ہے''۔ اپنے ہی ماضی سے بے خبر' ناآشنا' اور اپنے ہی انجام سے انجان ؎

پہلا سا التفات نہ پہلی سی سادگی ہے
کتنا بدل گیا ہے تری انجمن کا رنگ!

مجھے انگریزی زبان وادب سے قطعاً اختلاف نہیں' مگر زبان کی آڑ میں رائج کلچر اور اس کے فروغ پر شدید تحفظات ہیں۔ درحقیقت اس تہذیب وثقافت نے نسلِ نو سے لازوال اور تابناک ماضی چھین لیا ہے۔ اس بھکارن نے اپنے گندے بدن کی آلودگیوں کے عوض پاکیزہ جوانیوں کو تاراج کیا ہے..... مسلم نوجوان خوشبوؤں' محبتوں' الفتوں کا نگر چھوڑ کر پستیوں کی راہ پر' علمی انحطاط' فکری زوال ساتھ ساتھ' اور نتیجہ قعرِ مذلّت..... تعلیم محض اے' بی' سی اور دعویٰ ''ہمچو ما دیگرے نیست!''

ایسے نوجوانوں کے افکار میں ''رُشدی ملعون'' معصوم اور ''اسرائیل'' حق بجانب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ ''دی مسلم لیڈر'' قرآنِ کریم ''ہولی بک'' اور نماز ''یوگا'' ہے۔ نماز کا مسنون طریقہ' جنازہ کی دعائیں' والدین سے حسن سلوک' ان کے لیے لغو اور بے فائدہ چیزیں ہیں۔ گھوم پھر کے کھانا' جوتے پہن کے سونا' کھڑے ہو کے پیشاب کرنا' ان کا معمولِ زندگی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''سعدی'' کوئی کپڑا بیچنے والا تاجر' ''اقبال'' کوئی مولوی شولوی' ''غالب'' کوئی شاعر وائیر' ''فردوسی'' کوئی خاتون شاتون' اور ''ابوالکلام آزاد'' کوئی کاتب شاتب ہوگا۔ یہ نوجوان بہنوئی کو ''جیجا جی'' مشکل کو ''کھٹنائی'' معافی کو ''شما'' خط کو ''پتر'' مبارک باد کو ''بدھائی'' وجہ کو ''کارن'' اور منظوری کو ''آشیر باد'' لکھ جاتے ہیں۔ انہیں دیوالی اور ہولی کی ساری رسمیں یاد ہوتی ہیں' یہ سندور کو پوتر اور گلے کی زنجیر کو منگل سوتر سمجھتے ہوئے سنہرے خواب دیکھتے ہیں۔ ہاتھ باندھ کے نمستے کرتے ہیں' دھوتی اور ساڑھی کو قومی لباس قرار دیتے ہیں۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' انہیں زبانی یاد ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کانوں میں بالیاں پہن لیتے ہیں اور شغلاً ''اشلوک'' بھی پڑھنے لگتے ہیں۔ اور اپنے ڈیڈی جی سے پوچھتے ہیں پتا جی! کیا سارے مُسلے راکھشس ہوتے ہیں.....؟

قارئین کرام! درج بالا سطور میں تحریر کیے گئے حقائق پر اگر کسی کو شک گزرے تو اپنے گردوپیش میں سرسری سی نظر دوڑا کے اور قلب وجگر تھام کے بچشمِ خود مشاہدہ کر سکتا ہے۔ عدمِ

التفات اور جدید سہولتوں نے ہم سے ہماری نسلوں کو جُدا کر دیا ہے۔ آج نوجوانوں کی راتیں نائٹ کلبوں میں گزرتی ہیں' سب کی گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز ہیں۔ سب ایک دوسرے کو ''وِش'' کارڈز بھیجتے ہیں، ''گفٹ'' پیش کرتے ہیں۔ دوستوں کو ''کنٹری سائیڈ'' پر پکنک کی دعوت دیتے ہیں۔ باہم ملتے ہوئے ''سمائیل'' دیتے ہیں۔ ''کرٹسی'' سب کچھ برداشت کرتے ہیں۔ کُتّے پالتے ہیں۔ ''راک اینڈ رول'' پہ گھنٹوں ڈانس کرتے ہیں۔ ''واک'' پر جاتے ہیں۔ ''ڈائیٹنگ'' کرتے ہیں۔ ''مساج'' کراتے ہیں۔ بال ''ڈائی'' کراتے ہیں۔ ''وِگ'' لگاتے ہیں۔ میک اپ کراتے ہیں' پونیاں لگاتے ہیں۔ پھٹی ہوئی' بھدّی اور غلیظ ''جینز'' پہنتے ہیں۔ اور ایک پہیے پہ موٹر سائیکل چلاتے ہیں۔ بقول اقبال ؎

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

حیرت تو یہ ہے کہ لڑکے لڑکیوں والے فیشن کرتے ہیں' اور لڑکیاں لڑکوں والے۔ ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی''..... جو کروں کا جم غفیر لگا ہے اور مسخروں کا میلا سجا ہے۔ معاشرہ وہاں پہنچ چکا ہے جہاں مَرد و زَن کے اختلاط نے ہر دو کی شناخت کو محلِ نظر کر دیا ہے۔ غربت بسر ہو جاتی ہے' مگر جہالت شرمندگی لاتی ہے۔ فرد کی ذلّت اسی تک محدود رہتی ہے مگر قوم و ملت کی رسوائی جگ ہنسائی کا سبب بنتی ہے۔ پاکستانی بچے' مسلم نوجوان' نظریاتی لوگوں کی اولاد' اور شوق جنس بدلنے کا' کہاں سے سیکھا یہ سب کچھ.....؟؟

کچھ روز قبل ڈیفنس میں ایک دوست کے ہاں دعوت پہ جانا ہوا' وہاں ایک صاحب نے ایک ایسا واقعہ سنایا جس پر ہنسی بھی خوب آئی اور رونے کو بھی دل چاہا۔ ہوا کچھ یوں کہ ڈیفنس کے ایک معروف چوک سے ایک کار گزری جسے بڑے بڑے بالوں والی لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔ ننگا سر اور کمر تک لچکتے سنہری بال۔ جوں ہی گاڑی چوک سے گزری' وہاں کھڑے چند نوجوان اپنی گاڑی میں بیٹھے اور کار کا تعاقب کرنے لگے۔ جب آگے جاتی کار میں بیٹھی لڑکی کو احساس ہوا کہ کچھ لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہیں تو وہ بیچاری گھبرا گئی۔ ہاتھ کار کے سٹیرنگ پر کپکپانے لگے اور سانسیں پھولنے لگیں۔ تاہم اُس نے کار کی رفتار قدرے بڑھا لی اور جلدی



سے اپنے محلے میں پہنچ گئی۔ تعاقب میں آنے والے لوگ بھی کب ٹلنے والے تھے' سو وہ بھی پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ مگر اب لڑکی کا گھر قریب آ چکا تھا اور وہ خاصی مطمئن بھی تھی۔ اس نے اپنے گھر کے سامنے کار روکی' جبکہ پیچھا کرنے والے ''شیروں'' نے بھی ٹھک سے گاڑی کار کے پیچھے لا کھڑی کی: ''تم سیر تو ہم سوا سیر''۔ لڑکی بھی کار سے باہر آ گئی اور لڑکے بھی۔ ہنسی اور حیرت کی انتہا اس وقت نہ رہی جب لڑکی کے چہرے پر نگاہ پڑی۔ وہ لمبے لمبے سنہری بالوں والی لڑکی نہیں بلکہ کلین شیو فیشن ایبل لڑکا تھا۔ بقول ماہر القادری ؎

دل کی نہ پوچھ معرکۂ حسن و عشق میں
کیا جانیے غریب کہاں کام آ گیا!

ان سب نوجوانوں کا تعلق پاکستان سے ہے۔ پاکستان میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے۔ اکثر نے امریکہ و یورپ کی شکل تک نہیں دیکھی اور نہ ہی کبھی واہگہ پار کیا۔ پھر کہاں سے سیکھ لیا یہ طرزِ تغافل؟ دین و اخلاق سے آنکھ مچولی؟ ظلم' غفلت' اور معصیت کا ہنر؟.....

''تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن' اپنا تو بن!''..... کیا عہد کم ظرف کی ہر بات گوارا کر لی جائے؟ زندگی اتنی بڑی غنیمت ہے کہ روشن خیالی اور جدت پسندی کے بدلے تاریخ اور مذہب گروی رکھ دیے جائیں؟ شام و سحر کی تگ و تاز فقط حرص و ہوس اور پیٹ کے تقاضے؟..... قصور وار کون؟ وہ ماں باپ جو اپنے بچوں کو کمالیہ' ٹنڈو آدم' سمندری' لالہ موسیٰ' چھانگا مانگا' اور کبیر والا سے لاہور' کراچی اور اسلام آباد لے آئے اور پھر ان کے ہر جائز و ناجائز کو اچھا اور بہتر قرار دیا۔ پیسے کی ریل پیل ہوئی تو بچپن کی محرومیوں کی ''تلافی'' شروع کر دی۔ ان کے ہاتھوں سے قاعدے اور سپارے لے کر انہیں آزاد انسان بنانے کی نیو رکھ دی۔ ڈانٹ ڈپٹ کو ''ہیومن رائٹس'' کی خلاف ورزی سمجھ کے ترک کر دیا۔ ان کے ہاتھوں میں آکسفورڈ پریس کی کتابیں پکڑا دیں۔ انہیں ڈش' کیبل' لیپ ٹاپ' اور انٹرنیٹ کا رَسیا بنا دیا' یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس کلچر میں زیادہ لذت ہو' وہ سادہ اور پینڈو ثقافت کو نگل جاتا ہے۔ لہٰذا آج ان کے بچے ان کے نہیں رہے' جارج' فلپ اور ایلزبتھ کے بچے بن چکے ہیں۔ پاکستان کے کم اور بھارت کے زیادہ رشتے دار لگتے ہیں۔ درحقیقت ہم اپنی نسلوں سے ایسی نسل پیدا کر چکے ہیں جو ہماری نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ نسل کسی کی بھی نہیں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ہنس کی چال چلنے والے کووں کو ہنس قبول کرتے ہیں نہ کوے۔

یہ مسئلہ اگر چند افراد کا ہوتا تو میں اسے ایک حادثہ سمجھ کر قبول کر لیتا' مگر یہاں تو پورا وطن اس آگ میں جل رہا ہے۔ تمام چھوٹے بڑے شہروں میں پروان چڑھتی نسل انگاروں سے کھیل رہی ہے۔ اب ممبئی' نیویارک' لندن' لاہور' اسلام آباد اور ڈونگا بونگا کے رہن سہن' رکھ رکھاؤ' اور ادب و آداب میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ اب آپ فورٹ عباس' شجاع آباد اور مرید کے میں بھی میڈونا' مائیکل جیکسن اور ہنی سنگھ کے گانے سن سکتے ہیں۔ ڈھیلی شرٹوں اور نیکروں میں ملبوس نوجوان دیکھ سکتے ہیں۔ لمبے بالوں اور پھٹی پتلونوں والی نسل کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ میں پھر کہوں گا کہ اس سارے قضیے میں سب سے زیادہ مجرمانہ کردار اُن والدین کا ہے جنہوں نے اقبال کے شاہینوں کو کرگس بنا دیا۔ دنیوی آسائش و آرام کے بدلے اخلاقی عادات اور اسلامی اقدار کو بہت دور دھکیل دیا۔ اتنا دور کہ اسلام انہیں اجنبی لگنے لگا ہے۔

بچہ ماں باپ کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اس کا پاکیزہ دل ایک قیمتی جوہر ہے۔ اسے جیسی عادت ڈالی جائے اور تعلیم دی جائے وہ اسی نہج پر پروان چڑھتا ہے۔ مگر کیا جائے حرص وطمع کے بحر بیکراں کا۔ میرا بیٹا ڈاکٹر ہو' انجینئر بنے' پائیلٹ ہو جائے' جہان بھر کی دولت اس کی مٹھی میں ہو۔ دنیا بیت جاتی ہے' دولت وارث لے جاتے ہیں' اور آخرت؟..... ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن''۔ جب عقلیں گمراہ ہو جائیں' دلوں کو تالے لگ جائیں' اور طبیعتیں منجمد ہو جائیں تو انسانوں کی تباہی دستکیں دیتی دیتی انہیں ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ ؎

تیز رکھنا سرِ خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد!

# کیا بائبل کا مطالعہ ضروری ہے؟

پروفیسر عبداللہ شاہین

پچھلے کچھ عرصہ سے ملک کے صحافتی اور ادبی حلقوں میں ایک نئی آواز کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی ہے۔ یہ صاحب اپنی کنیت ''ابویحییٰ'' کے نام سے رقمطراز ہیں۔ انہوں نے مذہب کو ''ادب'' کے رنگ میں پیش کرنا شروع کیا ہے اور مذہبی حقائق کو فکشن (ناول اور افسانہ) کے جدید انداز میں تحریر کرنا شروع کیا ہے۔ مگر ان کی سوچ میں کچھ زیادہ ہی جدیدیت آ گئی ہے اور انہوں نے اہلِ علم حضرات کی رہنمائی میں عوام کو سابقہ آسمانی کتابوں تورات اور انجیل سے استفادہ کی دعوت و ترغیب دینا شروع کی ہے۔ چنانچہ ان کے ماہنامہ ''انذار'' کے شمارہ اگست ۲۰۱۴ء میں ''سابقہ کتب اور مسلمان'' کے عنوان سے ایک معترضانہ مکتوب کے جواب میں ان کی وضاحت پڑھنے کو ملی، جس کا متن کچھ یوں ہے:

''.....ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمان علماء کو قدیم کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور سابقہ انبیاءؑ کی تعلیمات کو گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ بات طے ہے کہ اب ہم قرآن و حدیث کے ذخیرے سے محروم نہیں ہو سکتے مگر ہم نے غفلت کا مظاہرہ کیا تو دیگر انبیاءؑ کی تعلیمات میں جو انتہائی قیمتی مواد، دعوتی اور تربیتی پہلو سے، دستیاب ہے اُس سے ضرور ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

میں نے جو آرٹیکل لکھا تھا.....اس میں یہ عرض کرنے کی کوشش کی تھی کہ اہلِ علم کو ان کتابوں سے بے نیاز نہیں ہونا چاہیے.....اس پر بعض سطحی علم رکھنے والے لوگوں نے اعتراض شروع کر دیا تھا..... چنانچہ مجھے ان سطحی علم والوں کو بتانا پڑا کہ کیوں کتب سابقہ سے استفادہ کرنا مسلمان اہلِ علم اور ان کی رہنمائی میں عام مسلمانوں کی ضرورت ہے؟

.....ویسے میں نے اس مضمون میں ایک کامن سینس (common sense) کا سوال بھی اٹھایا تھا.....کہ ہم لوگ اپنی گفتگو اور تحریروں میں اہلِ علم اور صوفیاء کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔ کیا اللہ کے نبیؐ اتنے بے وقعت ہیں کہ علماء اور صوفیاء کے اقوال تو



نقل کرنا جائز ہو اور جہاں حضرات انبیاءؑ کا معاملہ ہو ان کی بات نقل کرنے پر طرح طرح کے اعتراضات شروع کر دیئے جائیں؟

..... پھر تو قرآن و حدیث کے علاوہ کسی عالم، صوفی اور دانشور کی بات بھی نقل نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ان میں سے کسی کی اتنی حیثیت بھی نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے قدموں کو چھونے والی مٹی کی بھی برابری کا دعویٰ کر سکے..... حالانکہ قرآن مجید میں ان پر ایمان کا حکم ملنے کے بعد ضروری تھا کہ ہم ان کتابوں کو اپناتے اور یہود و نصاریٰ کی تحریفات سے چھڑاتے۔'' (ابویحییٰ)

مذکورہ بالا تحریر بظاہر بڑی خوبصورت اور نہایت دلآویز ہے، لیکن اس کے عواقب خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس تحریر میں اٹھائے گئے پرتکلف نکات کا بالترتیب تجزیاتی جواب عرض ہے:

**(۱)** ''مسلمان علماء کو قدیم کتابوں (تورات، انجیل) کی طرف رجوع کرنا چاہیے، وگرنہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں جو انتہائی قیمتی مواد دستیاب ہے اس سے ہم ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔''

**جواب** : —— پیش نظر رہے کہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں جو بھی حکیمانہ مواد موجود تھا اور جسے ''ما کان و ما یکون'' کا علم محیط رکھنے والے **عالم الغیب و الشھادۃ** رب نے اپنے بندوں کے لیے مفید اور ناگزیر سمجھا اسے پیارے نبیوںؑ کے نام لے لے کر اپنی آخری اور کامل کتاب ''قرآن مجید'' میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ جیسے ''**قال نوح** ..... **قال ابراھیم** ..... **قال موسیٰ** ..... **قال عیسیٰ**..... علیہم السلام —— پس سابقہ آسمانی کتابوں کو کھنگالنے کی چنداں ضرورت نہ رہی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے بندوں کے لیے یہاں تک دعوتی اور تربیتی مواد کا اہتمام کیا کہ اپنے ایک صالح بندے جنابِ لقمانؒ کی حکیمانہ باتوں کو بھی قرآن مجید میں محفوظ کر دیا، حالانکہ وہ نبی نہیں تھے۔

**(۲)** ''.....کتبِ سابقہ سے استفادہ کرنا اہلِ علم اور ان کی رہنمائی میں عام مسلمانوں کی ضرورت ہے''۔

**جواب** : —— یہ نکتہ بھی بودا ہے۔ بائبل (زبور + تورات + انجیل) کا مطالعہ عوام الناس کے لیے ہرگز ضروری اور مفید نہ ہے، کیونکہ نبی آخر الزمان ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَا تُصَدِّقُوْا اَھْلَ الْکِتَابِ وَلَا تُکَذِّبُوْھُمْ ، وَقُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْنَا)) (صحیح البخاری)

''تم نہ اہلِ کتاب کی تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو' بلکہ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس (یعنی قرآن) پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کیا گیا ہے۔''

یعنی مسلمانوں کو صرف قرآن پاک کی تصدیق اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ تاہم مخصوص مناظر اسلام اہلِ علم کو ان کتابوں کے متن صرف اس مقصد اور مصرف کے لیے معلوم ہونا مفید ہوسکتا ہے کہ تورات وانجیل کے پیروکاروں یہودیوں اور عیسائیوں پر اسلام وقرآن کی حقانیت واضح کرنے کے لیے ان ہی کی کتابوں کے حوالے پیش کیے جاسکیں۔

**(۳)** ''.....ہم لوگ اپنی گفتگو اور تحریروں میں اہلِ علم اور صوفیاء کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔ کیا اللہ کے نبیؐ اتنے بے وقعت ہیں کہ علماء اور صوفیاء کے اقوال تو نقل کرنا جائز ہو اور جہاں حضرات انبیاءؑ کا معاملہ ہو ان کی بات نقل کرنے پر طرح طرح کے اعتراضات شروع کر دیے جائیں؟''

**جواب** : —— یہ نکتہ بظاہر وزنی اور پُرتاثیر ہے' لیکن بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو اصل بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے جتنے اقوال اور جو تعلیمات عنداللہ محفوظ رکھنا مطلوب تھیں انہیں قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس پر مستزاد بائبل سے حوالے سراسر تکلف ہے۔ نیز فرمان نبی ﷺ اصل الاصول ہے کہ ((وَلَوْ كَانَ مُوْسٰى (عَلَيْهِ السَّلَامُ) حَيًّا مَّا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِيْ)) (احمد' بیہقی) ''اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں میری اتباع کے دائرہ میں شمولیت ناگزیر تھی''۔ دوسری روایت میں ہے: ((لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا وَاَدْرَكَ نُبُوَّتِيْ لَا تَّبَعَنِيْ)) (دارمی) ''اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو لازماً میری پیروی کرتے۔'' لہٰذا نبیوں کے نبی سیدنا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بتائے گئے اسی اصول کے مطابق ان اکابرین وصلحاء کے اقوال بطور حوالہ جات استعمال کیے جاتے ہیں کہ یہ علماء وفضلاء اور دانشور امت مسلمہ کے دائرہ میں ہیں۔ نبی کریم ﷺ آخری نبیؐ ہیں۔ یہ علمائے اُمت آپ ﷺ کے وارث اور نائبین ہیں۔ انہوں نے جو بات بھی کہنی ہے ذاتی رائے سے نہیں بلکہ قرآن و حدیث اور شریعت محمدیہؐ کے حوالہ سے کہنی ہے۔ اس لیے تحریروں میں ان کے تذکرے ملتے ہیں۔

**(۴)** ''.....مسلمان اپنی قوم پرستانہ سوچ کی بنا پر سابقہ انبیاءؑ کی کتابوں کو اہلِ کتاب کی کتابیں سمجھتے ہیں' حالانکہ قرآن مجید میں ان پر ایمان لانے کا حکم ملنے کے بعد ضروری تھا کہ ہم ان کی کتابوں کو اپناتے اور یہود ونصاریٰ کی تحریفات سے انہیں چھڑاتے۔''



**جواب** : —— اس نکتہ کا تفصیلی جواب یہ ہے کہ ان کو ''اپنانے'' کی دعوت دینا انتہائی تشویشناک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر صرف ایمان لانے کا حکم دیا ہے' اتباع اور پیروی کا حکم کہیں نہیں دیا' بلکہ نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے امت مسلمہ کو خبردار اور چوکنا کر دیا گیا ہے:

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾﴾ (البقرۃ)

''اور (اے نبی ﷺ! بالفرض) اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اس علم (قرآن) کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے تو بلاشبہ آپ بھی ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔''

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ﴾ (المائدۃ:۴۸)

''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی حق کے ساتھ جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر نگران ہے' پس آپ فیصلہ کیجیے ان کے درمیان اس (قرآن) کے مطابق جو آپ کی طرف اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی مت کیجیے اُس حق کو چھوڑ کر جو آپؐ کے پاس آ چکا ہے۔''

لہٰذا اب قابلِ اتباع اور قابلِ عمل صرف قرآن واسلام ہے جس کا دوٹوک اعلان من جانب اللہ یوں کر دیا گیا ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین (اسلام) مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت (یعنی قرآن) پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا!''

چنانچہ واضح کر دیا گیا:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ (آل عمران:۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین و مذہب کا انتخاب کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔''

یہاں تک کہ اہلِ کتاب کا بطور خاص ذکر کر کے بتا دیا گیا:

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۟ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَھُمْ ؕ﴾ (آل عمران:۱۹)

''یقیناً اللہ کے نزدیک دین تو صرف اسلام ہی ہے۔ اور اہل کتاب (عیسائیوں اور یہودیوں) نے (قرآن واسلام کو حق) جاننے کے باوجود ضد بازی کے باعث ماننے سے انکار کر دیا۔''

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ نزولِ قرآن کے بعد سابقہ آسمانی کتب منسوخ ہو چکی ہیں اور قرآن ان کا ناسخ ہے۔ چنانچہ حدیث وسنت سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ جیسے روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ تورات کا ایک نسخہ لے کر آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ تورات کا نسخہ ہے۔ آپ ﷺ خاموش رہے۔ جنابِ عمرؓ نے اسے پڑھنا شروع کیا اور رسول اللہ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے) کہا: گم کرنے والیاں تمہیں گم کریں، تم رسول اللہ ﷺ کے چہرے کی طرف نہیں دیکھتے؟ اس پر جناب عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا تو پکار اٹھے: ''میں اللہ کے غضب اور اس کے رسول ﷺ کے غصہ سے اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ ہم راضی ہوئے اللہ کے رب ہونے پر، محمد ﷺ کے نبی ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر''۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، اگر تمہارے سامنے موسیٰ (علیہ السلام) ظاہر ہو جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرو تو تم راہِ راست سے بھٹک جاؤ گے۔ اگر وہ زندہ ہوتے اور میری نبوت (کا زمانہ) پا لیتے تو لازماً میری پیروی کرتے۔''(۱)

رہی مصنف مضمون کی یہ بات کہ سابقہ آسمانی کتب کو تحریفات سے پاک کرنا چاہیے، تو اوّلاً یہ کتابیں عبرانی زبان میں تھیں اور ہم تک صرف تراجم ہی پہنچے ہیں، لہٰذا ہمارے پاس کوئی ذریعہ اور کسوٹی کھرا کھوٹا الگ کرنے کی نہیں ہے، سوائے قرآن وحدیث کی مطابقت کے، جسے راقم مضمون نے بھی تسلیم کیا ہے۔ بقولہٖ:

''اس ضمن میں جو اصل شرط ہے وہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان (سابقہ آسمانی کتابوں) کے حوالے سے نقل کردہ کوئی بات قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو۔''

(۱) دارمی —— مشکاۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ



پس کیوں نہ ہم ''اصل شرط'' یعنی قرآن وحدیث کو ہی مضبوطی سے تھام لیں تاکہ گمراہ ہونے سے بچ جائیں، کیونکہ تمام انسانوں اور جنّوں کی طرف بھیجے گئے نبی آخر الزماں ﷺ کا واضح، حتمی اور قطعی فرمان اور اعلان ہے:

((تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا : کِتَابُ اللّٰہِ وَسُنَّۃُ رَسُوْلِہٖ)) (مؤطا)

''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں۔ تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے، یعنی اللہ کی کتاب (قرآن) اور اس کے نبی ﷺ کی سنت (وحدیث)۔''

وما علینا الا البلاغ

## بقیہ: آپ حج سے کیا لے کر لوٹے؟

پس، اے محترم اور پیارے حاجیانِ حرمین شریفین!

آپ پوری سوچ بچار سے یہ عہد کر کے اپنے ہاں نئی زندگی کا آغاز کریں کہ ایک طرف آپ کو اپنی ساری سرگرمیوں کا جائزہ لے کر ان تمام چیزوں کو چھانٹ دینا ہے جو خلافِ دین ہیں یا مشتبہ یا لغو ہیں۔ اپنے نئے مشاغل کا پورا نقشہ از سرِ نو تیار کرنا ہے۔ دوسری طرف آپ کو اپنے گھر کے ماحول کو بدلنا ہے۔ ایک حاجی کے گھر میں نماز اور قرآن کا دور دورہ ہونا چاہیے۔ ایک حاجی کے گھر میں پردے کا صحیح شرعی اہتمام ہونا چاہیے اور بے پردگی کے ساتھ ساتھ منافقانہ پردے کا سلسلہ رک جانا چاہیے۔ ایک حاجی کے گھر میں نہ حرام مال داخل ہونا چاہیے، نہ ناہنجار قسم کی رسمیں اور فیشن پنپنے چاہئیں۔ تیسری طرف آپ کو یہ فکر کرنی ہے کہ آپ اپنے محلے، اپنے علاقے یا شعبے، اپنے کاروباری یا دفتری حلقے میں خدا اور رسولؐ کے دین کی دعوت کس طرح پھیلائیں اور اس کام میں کس جماعت یا ادارے یا کن افراد کے ساتھ تعاون کریں۔

حج کے بعد دعوتِ دین کا آپ کو زبردست علمبردار ہونا چاہیے۔ خدا آپ کو حج کے بعد کی زندگی میں مزید سعادتیں اور برکتیں عنایت فرمائے۔

(ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' شمارہ نومبر ۱۹۸۱ء)

# ذُوالقرنین، سدِّ ذُوالقرنین اور ـــــ یاجوج ماجوج (۳)

شاہین عطر جنجوعہ

انسان کے تہذیبی ارتقاء کا انتہائی اہم واقعہ وہ ہے جب انسان شکاری مڑگشت کرتے جتھوں کی زندگی کو ترک کر کے زراعتی آبادکاری کی زندگی میں داخل ہوگیا۔12000 سال ق م آخری برفانی عہد ختم ہوگیا۔Hunter gotherer انسان کو اتفاقاً معلوم ہوگیا کہ گھاس کے دانے (گندم، گیہوں) بوکر فصل سے دوبارہ حاصل کیے جاسکتے ہیں، جس سے خوراک حاصل ہوتی ہے اور دوبارہ فصل بھی اگائی جاسکتی ہے۔یعنی ''زراعتی آبادکاری'' زندگی شروع کردی۔زراعتی زندگی تقریباً دس ہزار سال ق م شروع ہوئی۔یہ واقعہ شرق اوسط میں پیش آیا، جس کا ثبوت قدیم شہر Jericho ہے۔یہ اولین زراعت اور آبادکاری کے آثار مہیا کرتا ہے۔اس کے بعد آبادکاری اور زراعتی زندگی کا آغاز وتوسیع دو دریاؤں دجلہ وفرات کے درمیان ہوا، جہاں دریاؤں کے بہاؤ کی وجہ سے زیریں علاقے کی زرخیزی اور دریائی پانی بیج بونے اور فصل اگانے کے لیے انتہائی موزوں تھا۔لہٰذا خانہ بدوشی، شکارگیری کی زندگی کے دوران کامیاب آبادکاری جس میں گندم کا بیج بوکر اور فصل کاٹ کر پھر دوبارہ بیج حاصل کیا جاتا تھا Mesopotamia میں ہوا۔یہاں پر چھوٹے چھوٹے قطعہ ہائے زمین آباد ہوئے۔چھوٹے چھوٹے شہر بنے جو اینٹ گارے کے بنے گھروں کے آشیانوں پر مشتمل علاقے ہوتے تھے۔آہستہ آہستہ شہروں پر مشتمل ریاستیں بنتی چلی گئیں، ایک شہری ریاستیں۔

قدیم ترین آبادکار Ubaidion تھے۔یہ نام ان کے آبادکردہ شہر Tell Ubaid کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ریاستوں میں باہمی مسابقت بھی شروع ہوگئی، کیونکہ محدود علاقے میں دو دریاؤں اور محدود خام مال سے ہی شہری زندگی کی ضروریات کی فراہمی ممکن تھی۔جنوبی



Mesopotamia جہاں دونوں دریا ملتے ہیں، میں سمیر (Sumer) کی شہری ریاست نمایاں ہوگئی۔سمیری شہر نے اردگرد کے شہروں کو اپنے ماتحت کردیا۔سمیری شہر میں تہذیب کے نسبتاً ترقی یافتہ خدوخال نمودار ہوئے، مثلاً بیوروکریسی، زبان، تحریر، حساب وغیرہ۔اسی لیے سمیری تہذیب مشہور ومعروف اور غالب ہوگئی۔یہ واقعہ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح ہوا۔شہری ریاست کا حکمران ریاست کا انتظام چلاتا تھا۔اس کے ماتحت پادری، بیوروکریٹ اور زمیندار ہوتے۔کاشت کاری کے محور پر ان کی معاشرت، مذہب اور معیشت گھومتی تھی۔شہر کے اندر زمینیں بادشاہ کی، مندر کی اور نجی ملکیت میں ہوتیں۔آہستہ آہستہ زمینوں کا ایک گروہ میں ارتکاز اور دوسرے گروہ میں محرومی پیدا ہوتی گئی۔یعنی زمیندار (Matgog) اور غریب کاشت کار/ہاری یعنی (gog) نمودار ہونے لگے۔زمینوں کے ارتکاز میں بہت سی وجوہات تھیں۔قرض کے نادہندہ ہونے یا اور کسی وجہ سے زمین فروخت ہوجاتی یا قبضہ ہوجاتی اور زمینیں چند لوگوں کے ہاتھ میں چلی جاتیں، یعنی بڑے بڑے جاگیردار بن جاتے۔اس اضافی دولت کے فائدے سے بادشاہ اور جاگیردار دونوں متمتع ہوتے۔

اس لالچ میں شہری ریاستوں کے حکمران ساتھ کی شہری ریاستوں پر حملہ کرتے اور ایک ریاست دوسری ریاست کو تباہ کرتی۔یعنی یاجوج ماجوج کی پہلے مقامی کشاکش شروع ہوئی اور پھر ملحق ''ریاستوں'' کی کشمکش۔یہ سلسلہ 2500 ق م سے زیادہ تیز رفتاری سے شروع ہوا، مثلاً Lagash کے حکمران (2375-2404 ق م) نے قریبی شہر Umma کو (2400 ق م میں) فتح کیا۔اس شہر میں Urinimgina (2279-2334 ق م) کی حکومت کے شروع میں شہر Umma نے پلٹ کر Lagash پر حملہ کردیا۔Umma کے حکمران نے جنوبی Mesopotamia کا بہت سا علاقہ فتح کرلیا۔پھر Umma پر سارگون آکادی نے حملہ کردیا۔سارگون کی حکومت ظالم تھی، (2125 ق م میں) Lagash پھر سے آزاد ہوگیا۔2017 ق م میں مغرب سے عرب کے عموریوں (Ammorito) نے Mesopotamia پر حملہ کردیا اور مشرق سے عیلام (Elam) نے 1764 ق م میں شمالی Mesopotamia میں قائم شدہ بابل کے حکمران Hammurabi نے جنوبی Mesopotamia کی سلطنت Larsa پر قبضہ کرلیا۔

چنانچہ حتیوں کی ترکی میں آمد (2000 ق م) اور عروج (1500 ق م) کے بعد کا زمانہ ان کے مشرق میں موجودہ دوسدیں (رکاوٹوں) یعنی دو دریاؤں دجلہ وفرات کے پرلی طرف

یاجوج ماجوج کے باہمی ٹکراؤ کے عروج اور توسیع کا زمانہ ہے۔یعنی ایک ریاست دولت یعنی ''زمین'' کی خاطر دوسری ریاست پر حملہ کرتی۔ یہ زمانہ محض Mesopotamia کے اندر شہری ریاستوں کی لڑائیوں کا زمانہ نہیں بلکہ اردگرد خانہ بدوشوں کے Mesopotamia کے علاقوں پر حملوں کے عروج کا زمانہ ہے۔

جنوبی Mesopotamia کے علاقوں کا شمالی اشوری ریاست (تقریباً 1600 ق م) کے تسلط میں آ جانے سے آشوری سلطنت قائم ہوئی۔اس سلطنت نے اپنی توسیع شروع کر دی' مثلاً جنوب مغرب میں موجودہ لبنان اور شام کی طرف۔ اب اس فساد سے ظاہر ہے مشرق اور مغرب کی تمام ریاستیں متاثر ہوتی تھیں۔ان ریاستوں میں Mesopotamia کے مغرب اور شمال مغرب میں موجود حتی (ذوالقرنین) ریاست تھی۔تاریخ میں یہ وہ مقام تھا جہاں یاجوج ماجوج کے فساد سے بچنے کے لیے حتی قوم (ذوالقرنین) نے لوہے اور تانبے (قطر) کی دیوار قائم کی۔

قرآن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ذوالقرنین نے ''زُبَرَ الْحَدِیْد'' مانگیں اور جب وہ دو کناروں ''صَدَفَین'' کے درمیان برابر ہوگئیں (تسویہ) تو ان کو خوب گرم کیا اور ان پر قطر (پگھلا ہوا تانبا) ڈالا۔اس دیوار کو یاجوج ماجوج نہ گرا سکتے تھے اور نہ نقب لگا سکتے تھے۔

دیوار بنانے کے لیے خام لوہے کے ڈھیلوں (lumps) کے بجائے لوہے کے زُبر (چادریں) استعمال کرنا کچھ غیر سمجھ دارانہ اقدام لگتا ہے اور ناممکن بھی۔ کیونکہ ہم ''زُبر'' کو لوہے کی چادریں کہہ تو دیتے ہیں لیکن اس شکل اور سائز کی چادریں جیسی آج ہم دیکھتے ہیں' ویسی 1500 ق م کیسے ممکن ہوسکتی تھیں؟ اس طرف ہمارا ذہن کیوں نہیں جاتا؟ عام سی لوہار کی بھٹی میں ہزاروں نہیں تو سینکڑوں چادریں بنانا تقریباً ناممکن ہے۔پھر یہ کہ لوہار کی بھٹی میں کتنی جسامت اور کس نوع کی ''چادر'' تیار ہوسکتی ہے؟ یہ ہیں وہ عملی مسائل جو اس دیوار کی ماہیت کے بارے میں ذہن میں سوال پیدا کرتے ہیں۔

میرے نزدیک لفظ ''زُبر'' سے ایک اور اشارہ مقصود ہے۔تحقیق بتاتی ہے کہ لوہے کی زُبر سے تیار کردہ حتیوں (ذوالقرنین) کی دیوار' تاریخ انسانی میں پہلی دفعہ ایجاد کردہ اسلحہ ''تلوار'' تھی۔

Mesopotamia کی شہری ریاستوں کی آپس کی لڑائیوں میں کاپر یا ٹن کو لکڑی کے



سرے پر لگا کر نیزے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور بیل گاڑیاں رسالے کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔copper یا tin کے چاقو یا تلوار فوراً ٹوٹ جاتے یا کج ہوجاتے تھے' اس لیے لڑائی میں کوئی خاص کام نہیں آتے تھے۔

حتیوں نے اس لڑائی جھگڑے کی مغرب کی طرف سے ممکنہ پیش رفت کی مزاحمت کے لیے تلوار ایجاد کی جو زُبر سے بنی ہوتی تھیں۔حتیوں نے لوہے کو کاربن سے ملا کر کوٹنے کا فن دریافت کرلیا۔کاربن سے ملا لوہا سٹیل بن جاتا جو لوہے سے زیادہ مضبوط ہوتا۔اس لوہے کو کوٹ کر وہ لمبی پتلی rods بناتے جنہیں قرآن نے 'زبر'' کہا ہے۔ان rods کو' جیسے آج کل رہائشی گھروں کے لیے ایک ''سریا'' استعمال ہوتا ہے' وہ ساتھ ساتھ رکھ کر برابر لمبائی کی دو چار یا چھ سلاخوں کو ملا کر تلوار بناتے۔سلاخوں کے سرے برابر کرنے کو میرے نزدیک قرآن نے ''سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ'' سے تعبیر کیا ہے۔اس کا مطلب ہے جب کنارے برابر ہوگئے۔

سلاخوں کو استعمال کرنے کا فائدہ کچھ یہ ہے۔فرض کریں آپ ایک 2 انچ چوڑی اور چار فٹ لمبی تلوار بنانا چاہتے ہیں۔ایک طریقہ تو یہ ہے کہ بھٹی میں لوہے اور charcoal کو ملا کر تپائیں اور پھر بار بار کوٹنے اور گرم کرنے کے عمل سے ایک ٹکڑے پر مشتمل سلاخ بنا دیں۔پھر اس کو دونوں لمبے کناروں سے کوٹ کر باریک کر کے یک طرفہ یا دوطرفہ دھاروں والی تلوار بنا دیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ باریک زبر یعنی rods لے کر ان کو ساتھ ساتھ رکھیں۔ان سلاخوں کے دونوں سرے برابر ہوں' یا برابر کریں اور مطلوبہ چوڑائی کے لیے دو چار یا جتنی ''زبر'' چاہیں ہوں' لے کر ان کو ایک سرے پر لوہے کے clip سے گرپ (grip) کریں اور گرم کر کے قطر (یعنی کاربن' کا پر جو بھی دوسری دھات تھی) ساتھ ملا کر کوٹیں اور کنارے باریک کریں۔ذیل میں اس کی schemetic اور تخیلاتی تصویر بناتا ہوں:

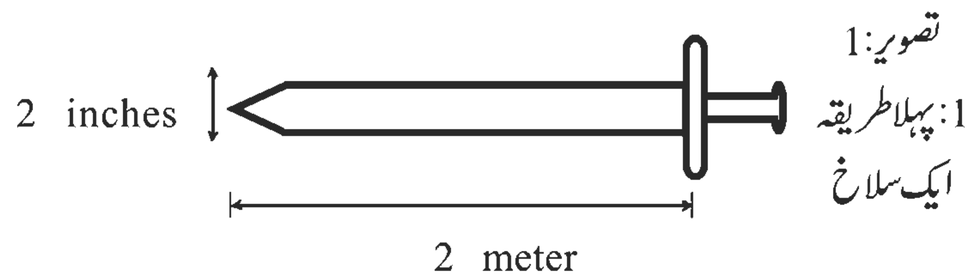


تصویر:1
1: پہلا طریقہ
ایک سلاخ

تصویر:2

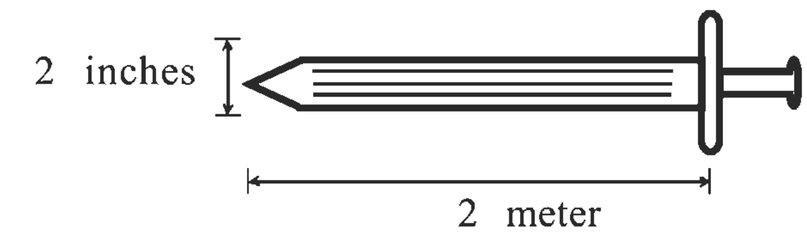


2:دوسرا طریقہ
چار سلاخیں

نوٹ: چوڑائی اور لمبائی سکیل کے بغیر ہے۔

یہ تلوار ایک سلاخ سے بنی تلوار سے زیادہ مضبوط ہوتی تھی۔ جلدی نہیں ٹوٹتی تھی اور ہلکی پھلکی بھی ہوتی تھی۔ غالباً اس کو welded pattern composite یا laminated sword بھی کہتے ہیں۔ ترکی سے دونوں طرح کی قدیم حتی تلواریں ملی ہیں۔ ایک سلاخ والی بھی اور ''زبرالحدید'' سے بنی ہوئی بھی۔

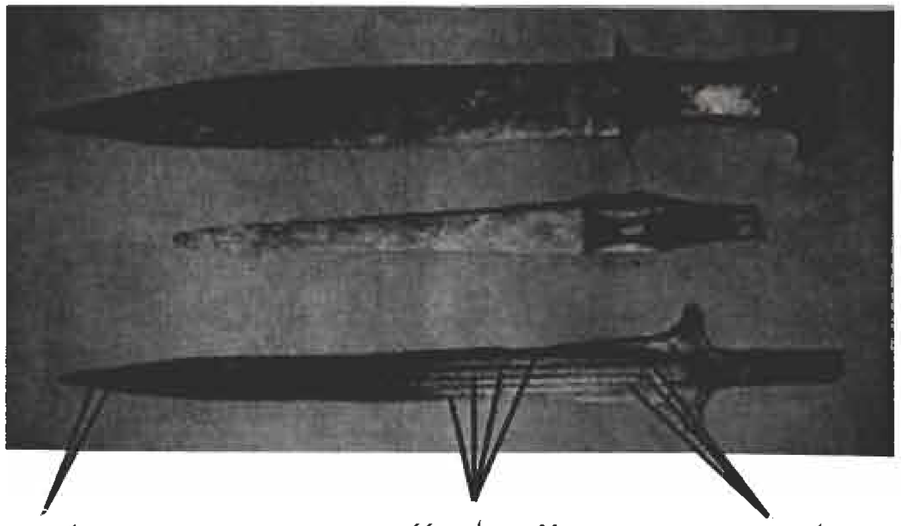

کناروں کی برابری (تسویہ بین الصدفین)

''زبرالحدید'' سے بنی تلوار

کناروں کی برابری (تسویہ بین الصدفین)

حتیوں نے یہ تلوار اپنے دفاع کے لیے بنائی اور اپنی اسی ایجاد کو خفیہ رکھا۔ قرآن نے جہاں ''سدذوالقرنین'' کا ذکر کیا ہے اس کی نوعیت بھی بتادی ہے:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝۹۷﴾

''پھر اس پر نہ چڑھ سکے اور نہ اس میں سوراخ کر سکے۔''

بظاہر ان الفاظ سے یہ معنی اخذ ہوتا ہے کہ وہ اتنی بلند و مضبوط دیوار تھی کہ نہ اسے گرایا جا سکتا' نہ اس کو عبور کیا جا سکتا اور نہ ہی اس میں نقب لگ سکتی۔ لیکن دیوار کا نہ گرنا تو سمجھ میں آتا ہے' لیکن عبور نہ ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے میری نظر اس آیت کے دوسرے پہلو کی طرف گئی کہ یہ



دیوار کی ''صفت'' بیان نہیں ہو رہی بلکہ دیوار کی ''قسم'' بیان ہو رہی ہے کہ وہ ان دیواروں میں سے تھی جو نقب لگا کر یا توڑ کر عبور نہیں کی جا سکتیں۔ اور ''تلوار'' ایک ایسی دیوار ہے جو نہ توڑ کر نہ نقب لگا کر عبور کی جا سکتی ہے۔ آج کے دور میں ہمیں ایسی ''دیوار'' کا مطلب سمجھنا آسان ہو گیا ہے جو توڑ کر یا نقب لگا کر عبور نہیں کی جا سکتی' مثلاً گن' میزائل' ایٹم بم وغیرہ' یہ ایسی دیواریں ہیں جو چڑھ کر عبور نہیں کی جاتیں۔

حتیوں نے اس تلوار کے ذریعے اشوریوں کی بڑھتی ہوئی سلطنت اور توسیع پسندانہ عزائم سے اپنا دفاع کیا۔ انہوں نے اس اسلحے کو اپنی سلطنت کی توسیع کے لیے استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے حملہ کر کے مشرق میں عراق کے زرخیز علاقے اپنے قبضے میں نہیں کیے۔ اس سے ان کی رحم دلی یا امن پسندی اور صلح جوئی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن جہاں ذوالقرنین (حتیوں) کے تلوار بنانے کا ذکر کرتا ہے وہاں قرآن کے یہ الفاظ:

﴿قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ﴾ (آیت ۹۵)

''بولا جو مقدور دی مجھ کو میرے رب نے وہ بہتر ہے۔''

ان کی امن پسندی یا قناعت' جو بھی کہہ لیں کے آئینہ دار ہیں۔ ورنہ امریکہ کی طرح ہوتے' جس نے ایٹم بم بناتے ہی جاپان پر تجربہ کیا' تو اور کچھ نہیں تو اپنے مشرق کے زرخیز علاقے کے ''مربعوں'' پر تو قبضہ کرتے.....؟

1184 ق م میں حتیوں کی دوسری سلطنت بھی زوال پذیر ہو گئی تو ان کی سلطنت سے ہجرت کر کے دوسرے علاقوں میں جانے والے لوگ یہ تکنیک' یعنی تلوار سازی کی تکنیک ساتھ لے گئے اور انہوں نے اس ایجاد کو دوسرے ''ملکوں'' میں پھیلا دیا (proliferate کر دیا۔) یہی وجہ ہے کہ اس وقت سے پہلے کے وقت میں آکادیوں اور عموریوں کے ہاں تلوار کا استعمال نہیں ملتا۔ لیکن آشوری' جن کی سلطنت کی ابتدا 1650 ق م کے قریب ہوئی' 587 ق م میں یہودیوں کی ریاست جودا (Judah) پر حملہ آور ہوئے تو تلواروں سے یہودیوں کو قتل کیا اور کہا جاتا ہے کہ ایک دن میں چھ لاکھ یہودی تہ تیغ ہوئے۔ آشوریوں کو تلوار سازی 1185 ق م میں حتیوں کے زوال کے بعد مہاجروں سے معلوم ہوئی ہو گی اور اس کے بعد انہوں نے سلطنت کی تیزی سے توسیع کی۔ یہ ہے وہ سد (سدذوالقرنین) جو انہوں (حتیوں) نے یاجوج ماجوج کے فساد سے بچنے کے لیے تعمیر کی۔ واللہ اعلم ❁❁❁

(جاری ہے)

Nov. 2014
Regd. CPL No. 115
vol. 63
No.11

Monthly Meesaq Lahore


# سانحۂ کربلا اور شہیدِ مظلوم رضؓ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی
عزیمت وعظمت کی صحیح تصویر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
مناقب اور آپ کی مظلومانہ
شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہد صدیقیؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا' آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا تھا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانیؓ ابولولو فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں۔
- علی مرتضیٰؓ کی طرح حضرت حسینؓ بھی قاتلینِ عثمانؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے

بانی تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

**کا مطالعہ کیجئے**

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
اشاعت خاص:85روپے اشاعت عام :55روپے
(علاوہ ڈاک خرچ)

**مکتبہ خدام القرآن لاہور**
36۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون:3-35869501
email:maktaba@tanzeem.org